بنام جہاندار و جاں آفریں
حکیم سخن بر زباں آفریں

نغمۂ جاوید

(شریمد بھگوت گیتا کا آزاد منظوم ترجمہ)

نواب مرزا جعفر علیخاں اثر لکھنوی

راج محل پبلشرز جموں کشمیر

پہلی بار تعداد ۲۰۰۰ قیمت تین روپے

پریم پرنٹنگ پریس جموں

تعارف

حضرتِ انسان نے جب سے ہوش سنبھالا، یعنی خورد و نوش کی تدبیر مقابلتہً بہ آسانی کر سکے اسی وقت سے بنائے عالم کے اسباب اپنی محدود فہم کے مطابق متعین کرتے رہے، ابتداءً ہر واقعہ یا ہر گزشت کا بانی مبانی کسی ایسی قوت یا قوتوں کو تصور کرتے رہے۔ جن کی نگاہ مہر یا چشم قہر اُن پر مخصوص اوقات میں ہوتی رہی، مثلاً بارش نہ ہوئی یا ایسی شدت سے ہوئی کہ جو کچھ بویا تھا بار آور نہ ہوا تو اس بدبختی کو پوشیدہ بالائے طاقت پر محمول کیا اور اُس کی خفگی دور کرنے کی تدبیر دادو دہش سے کر کے اطمینان حاصل کر لیا، خواہ پیش کش پایۂ قبولیت کو پہنچی یا نہ پہنچی۔

لاکھوں سال کے متواتر مشاہدہ اور تجربہ سے رفتہ رفتہ قوانین قدرت سے آگاہی بڑھتی گئی اور علم ہیئت (سائینس) کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں علم اور مذہب کے درمیان ایک شدید تصادم ہوا اور صدیوں پرانے عقائد متزلزل ہو گئے۔ گذشتہ تقریباً نوّے ۹۰ سال میں سائینس کی ترقی روزافزوں رہی ہے اور میدان تحقیقات میں بہت وسعت آگئی ہے۔ گو رمز کائنات ہنوز مستتر ہے اور غالباً تا ابد رہے گا، بقول حضرت سعدیؒ: ع۔ ہنوز ما بہمانستیم در اول وصف تو ماندہ ... با ایں ہمہ مغربی دنیا کو اپنے علم کی حقیر پونجی پر بڑا ناز ہے مگر [illegible] ادھر تو اس عجز کا اعتراف کہ کائنات کی حقیقت کو نہ پا سکے، اُدھر صانع گیتی کے وجود سے انکار! بہرحال عام یقین یہ ہے کہ موجودہ معلومات کے مقابلے میں ہمارے پیش رو کور دیدہ تھے، حالانکہ اس گمان کی تردید خود ایسے تجسس کے نتائج سے ہو چکی ہے جو علمِ معدنیات کا ایک جزو ہے۔ صرف ملک ہندوستان میں جو کدال اور پھاوڑے

نے ہویدا کر دیا اس امر کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے کہ دس ہزار سال قبل جو لوگ اس قطعہ ارض میں بستے تھے وہ اتنے جاہل اور نابلد نہ تھے جیسا کہ خیال کیا جاتا ہے اور اگر مصر و شام کی طرف نظر ڈالی جائے تو ماننا لازم آتا ہے کہ اس سے بھی زیادہ مدت پیشتر وہاں کے باشندے جو جو کارہائے نمایاں کر گئے وہ آج بھی ہمارے حیطہ امکان و قدرت سے باہر ہیں - خیر -

بادی النظر میں یہ امر بیّن ہے کہ ابتدا سے انسان کو سکون طبع کی تلاش رہی، وہ سکون جو صرف اصل حقیقت کے علم حاصل ہوتا ہے - ہمارے ملک میں ہزارہا سال پیشتر ہر پہلو سے حل مرحلہ کی تدقیق ہو کر یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ ع خدا کی باتیں خدا ہی جانے - تاہم آسائش روح کے وہ ذریعے سوچے گئے جن کے بغیر قلب کی بیتابی اور دل کی بے چینی نہیں جاتی اور زیست کے صدگونہ مخمصوں سے نجات نہیں ملتی - مذہب کا موضوع اسی تلاش کی تعریف میں آتا ہے اور مذہبی تلقین حصول مقصد کا جادہ ہے اس کو حدیث، مارگ، دھرم کسی نام سے تعبیر کر لیجئے ؎

شریمد بھگوت گیتا میں بھی ایک راستہ بتایا ہے - وہ راستہ شاہراہ عام ہے کسی فرقہ اور ملت کے لئے محدود نہیں، ہر فرد بشر اس راہ مستقیم پر ثابت قدم رہ کر منزل مقصود تک پہنچ سکتا ہے، یہ امر اتفاقی ہے کہ کس شخص نے کس خطہ ارض میں نشو و نما پائی اور اس اتفاق کے ماتحت کسی خاص مذہبی پیشوا کا پیرو ہوا، گہری نظر سے دیکھا جائے تو جملہ واعظان دین کی تلقین کا ایک ہی مرکز اور ایک ہی منشا ہے، جو مجادلہ یا مناقشہ پر اتر آئے اس کا قصور فہم ہے - ہر ملت کا پیرو ہر خدا رس بانی دین کی ہدایت سے فیضیاب ہو سکتا ہے اور انہیں خدا رس، متبرک افراد کو دنیا کے مختلف حصوں میں نبی، رسول، مسیحا، اوتار مانا گیا ہے شخصیت سے گزر کر اگر اصل تلقین کی طرف آئیے تو سوالِ توفیق کا رہ جاتا ہے - توفیق سے یہاں مراد قلبی احساسات سے ہے - اگر کسی

انسان کا دل گواہی دے کہ میں اس راستے سے منزل تک پہنچ جاؤں گا۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اس راستے کو اختیار نہ کرے۔ اس سے قطع نظر کہ ہادی کون ہے، یہاں استدلال کو دخل نہیں۔ بلکہ عقل و عقیدہ کا اتصال رحمتِ ایزدی کا محتاج ہے، چنانچہ آثرؔ صاحب نے اُردو دان دنیا کے مطالعہ کے لئے گیتا کی تلقین ایک سہانے پیرایہ میں بیان کر دی ہے اور راقم السطور کو توقع ہے کہ مرزا صاحب کا ترجمہ مقبول عام ہوگا۔ مترجم کی قدرت و جامعیت کلام پر تبصرہ کرنا میری کم مائگی کا اشتہار ہوگا۔ لہٰذا ایسی جسارت کا ارتکاب نہ کرتے ہوئے یہ قلمبند کرنا کافی ہوگا کہ جس طرح گیتا کی تلقین کا تجزیہ کیا گیا ہے وہ صرف قابلِ تحسین ہی نہیں بلکہ باعثِ حیرت ہے۔ ملاحظہ ہوں ذیل کے اشعار :-

نہ قاتل کوئی ہے نہ مقتول ہے
اَمر آتما، ما سوا بھول ہے
کبھی آتما مار سکتی نہیں
یہ خود موت سے ہار سکتی نہیں
یہ دائم ہے، پیدا ہوئی ہی نہیں
جو پیدا نہ ہو وہ فنا بھی نہیں
نہ تھا کوئی لمحہ کہ جب یہ نہ ہو
اچنبھا ہے اول کہ آخر کہو
ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے
فقط جسم مرتا ہے، مرتا رہے

معطل نہیں ایک پل بھی کوئی
خلاف اس کے فطرت ہے انسان کی
تصور عمل ہے، تخیل عمل
تعطل کا پھر کون سا ہے محل
بظاہر معطل جو انسان ہے
تو جولاں خیال اُس کا اُس آن ہے

نہیں ہے جو نادان دانائے راز
سمجھتا ہے اپنے تئیں کارساز
یہ مَیں نے کیا اور وہ مَیں نے کیا
درانحالیکہ دخل مطلق نہ تھا!

مگر جو ہے رمز آشنائے خودی
سمجھتا ہے وہ لِم ہر اک بات کی
جو منشائے فطرت ہے معلوم ہے
کدھر سب کی رجعت ہے معلوم ہے

حواسوں کی بازی حواسوں سے ہے
یہ پیاسوں کی پیکار پیاسوں سے ہے

مناظر مظاہر سے پردا ہُوا
خود اپنا ہی محوِ تماشا ہُوا

خوشی جو حواسوں سے پیدا ہوئی
حواسوں نے دی اور حواسوں نے لی
نظر آیا پہلے تو امرت گھلا!
مگر بعد کو منھ کسیلا ہُوا

مترجم کو سراہنا مقصود نہیں، اس سے بھی کم تر یہ مقصود ہے کہ مقابلہ و موازنہ سے دیگر علما اور سخن دانوں کی توقیر گھٹائی جائے۔ بہر حال چونکہ میں نے گیتا کے متعدد ترجمے مختلف زبانوں یعنی اُردو، فارسی، انگریزی میں بغور پڑھے ہیں مجھے یہ کہہ گزرنے میں مطلق تردد نہیں کہ اخذ و تفسیر کے لحاظ سے گیتا کی ماہیت جو اثر صاحب کے ترجمے میں پائی جاتی ہے کمیاب ہے۔ اس کی تصدیق اہل فکر و نظر اس ترجمہ کے مطالعہ سے بہ آسانی کر سکتے ہیں۔

(کرنل سر) کیلاس نارائن ہاکسر (سی۔ آئی۔ اے)

پیش لفظ

خان بہادر مرزا جعفر علی خاں اثر ایم ۔ بی ۔ ای کا ترجمہ بھگوت گیتا اردو نظم میں میں نے پڑھا اور بہت محظوظ ہوا ۔ گیتا کی تلقین مسائل الوہیت و مابعد الطبیعۃ سے علیحدہ نہیں ہو سکتی ۔ مگر ان پہلوؤں پر میں زیادہ لکھنا نہیں چاہتا ۔ یہ مسائل بہت دقیق ہیں اور ان کی پوری تشریح و توضیح اختصار کے ساتھ ممکن نہیں صرف چند کلمات ان کے متعلق لکھتا اور ان ہی پر اکتفا کرتا ہوں ؛

اول یہ کہ صوفیائے کرام کے اعتقادات کا ماخذ بھی قرآن مجید ہے ۔ چنانچہ مولانا روم جو صوفی شعرا میں پایۂ کمال رکھتے ہیں فرماتے ہیں کہ ؎

من ز قرآں مغز را بر داشتم استخواں پیشِ سگاں انداختم

قرآن مجید میں آیا ہے نحن اقرب من حبل الورید جس کا یہ مطلب ہے کہ میں پُرش میں دیا ایک ہوں حضرت علی کا بھی قول ہے کہ من عرف نفسہ، فقد عرف ربہٗ ؛

گیتا میں الوہیت کے مسائل پر جو کچھ کہا گیا ہے ۔ اس کا خلاصہ آیاتِ بالا میں اچھی طرح ادا ہو گیا ہے ؛

دوم ان مسائل کو پوری طرح سمجھنے کے لئے آنکھیں روحانیت سے روشن ہونی چاہئیں ۔ یہ بات آجکل کے قارئین میں کم پائی جاتی ہے ۔ قاآنی ایک قصیدے میں جو اس نے توحیدِ باری پر لکھا ہے ۔ کہتا ہے کہ ؎

بہ پیش آں کِت از عینِ عیاں جوید نہاں نیستی بہ نزد آں کِت از عینِ نہاں جوید عیاں نیستی

یہ "عینِ نہاں" آجکل عموماً مفقود ہے ، گیتا میں یہی مطلب جن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے ۔ اُس کا مرزا صاحب یوں ترجمہ کرتے ہیں :-

عیاں ذات میں اپنی ہیں ہم ان یہاں — وہ اندھے ہیں جن کو ہوا ہے گماں
فنا و تعین سے یکساں ہوں دور — جو مطلق ہے اس کا ہو کیونکر ظہور

لہٰذا اُلوہیت کے متعلق جو کچھ گیتا میں کہا گیا ہے اور جس کی شری کرشن نے متواتر توضیح کی ہے۔ اتنا ہی لکھنا کافی ہے۔

گیتا میں فلسفۂ علم (گیان)، و عمل (کرم) دونو پائے جاتے ہیں فلسفۂ عمل کی نسبت جو خیالات ظاہر کئے گئے ہیں۔ فی زمانہ اُن کی تشریح و اشاعت ضروری ہے یورپ میں آجکل جو کہرام مچا ہوا ہے اور جس کی پیروی فی الحال ہندوستان میں بھی تا حد امکان کی جاتی ہے اور جو مذہبی اور فرقہ وارانہ تصادم و تضاد کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اُس کے دفعیہ کے لئے اس موعظت کی بہت ضرورت ہے جو فلسفۂ عمل کے شعبے میں بیان کیا گیا ہے۔ دانایانِ یورپ بھی آجکل اس فکر میں ہیں کہ کسی نہ کسی طرح اُس تضاد و تخالف کا استیصال کُلّی کیا جائے۔ جو آجکل یورپ میں برسرِ کار ہے۔ وہ بھی اس رائے پر مائل ہوتے جاتے ہیں کہ انیسویں صدی میں عقلِ انسانی نے روحانیت سے مُنہ بالکل پھیر لیا، وہ بھی اب مانتے ہیں کہ روحانیت کا پس منظر پیدا کر لے کے بغیر اخلاقیات کی تعلیم رائگاں جاتی ہے، بہرحال تمدّن اور اخلاقیات کا جو فلسفۂ عمل گیتا میں ظاہر کیا گیا ہے اس پر ہند کے قارئین اور دانایانِ یورپ کو غور کرنا چاہیئے۔

شری کرشن تعطل عمل کو اچھا نہیں سمجھتے۔ شروع میں اور اخیر میں ارجن سے بار بار کہتے ہیں کہ لڑائی سے احتراز نہ کر۔ اعمال کے جو اصول وہ بیان کرتے ہیں اُن کا ذکر اکثر جگہ آیا ہے اور جن الفاظ میں مرزا صاحب نے ان کا ترجمہ کیا ہے۔ درج کرتا ہوں۔ مختلف ادھیاؤں سے اقتباس کیا گیا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ عمل فرض سمجھ کر کرنا چاہیئے۔ اُس سے ثمر کی

ادھیائے ۴، ۵ میں آتا ہے کہ جو شخص صحیح طریقۂ عمل اختیار کرتا ہے۔ اس کی نسبت یہ کہا جاسکتا ہے، کہ ؎

خواہش نہ رکھنی چاہیئے، اسی کو سنسکرت میں نشکام کرم کہتے ہیں ؂

خلش آرزو کی وہ رکھتا نہیں — یہ خار اُس کے دل میں کھٹکتا نہیں

غرض کوئی شامل نہیں کام میں — جو ڈالے خلل اُس کے آرام میں

؂ ؂ ؂ ؂ ؂ ؂ ؂

عمل سے توقع ثمر کی نہیں! — لہٰذا کبھی مضطرب ہی نہیں

عمل بہرِ تسکیں ہے کافی اُسے — نہیں کوئی فکرِ تلافی اُسے

جو بے فکرِ انجام ہو، کام ہے — وگرنہ گئے وقت کا نام ہے

تعلقاتِ دنیوی سے علیحدگی کی تعلیم ان الفاظ میں ہے۔ ادھیائے ۶ ؎

نہ ہو گر علائق سے وارستگی — نہ ہو روحِ اعظم سے وابستگی

گناہوں سے جس دم کنارہ ہُوا — وہیں اس طرف سے اشارہ ہُوا

برہم سے ہُوا جس گھڑی اتحاد — خودی اُٹھ گئی اور شورِ تضاد

حافظؔ نے علائق سے وارستگی کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے ؎

غلامِ ہمّت آنم کہ زیرِ چرخِ کبود

ہر آنکہ رنگِ تعلق پذیرد، آزاد است

ابنائے جنس کے ساتھ کس طرح سلوک کرنا چاہیئے۔ ادھیائے ۹

نہ اس سے بھلا اور نہ اُس سے بُرا — یہاں میں ہوں سب کیلئے ایک سا

کہ جو کچھ یہاں ہے وہ میرا ہی ہے — نہ لینا کسی سے نہ دینا ہی ہے

ادھیائے ۱۲ :- ؎

جو اہلِ جہاں کو ستاتا نہیں — یہاں وہ ستایا بھی جاتا نہیں
سب اپنے پرائے نظر میں ہیں ایک — اب اس میں کوئی بدگہر ہو کہ نیک

ایذا رسانی سے پرہیز کو شیخ سعدی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:-

من آں مورم کہ در پایم بمالند — نہ زنبورم کہ از نیشم بنالند
کجا خود شکر ایں نعمت گزارم — کہ زور مردم آزاری ندارم

آج کل کے اکثر پولیٹکل لیڈروں کا جو طرزِ عمل ہے، اُس کے برخلاف شری کرشن نے یوں تنبیہ کی ہے۔ ادھیائے ۱۲

نکوہش کا خوف اور نہ شہرت کی آس — رضا و خموشی کی دولت ہے پاس
نہ گھر بار کی اس کو خواہش کوئی — نہ شوق نمود و نمائش کوئی
ارادے ہیں مضبوط اور دل جواں — نہ وہ شادماں ہے نہ وہ سرگراں
بہت مجھکو پیارا ہے ایسا جو ہے
بہت منزلیں کر چکا ہے وہ طے

اعمال میں جن اصولوں کو مدِ نظر رکھنا چاہیئے۔ اُن کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے۔ ادھیائے ۱۶

جو ہے منکسر اور نیکو شعار — مگر اس کے باوصف ہے بردبار
کسی کو جو آزار دیتا نہیں — جو اوروں کا احسان لیتا نہیں
جو مدِ نظر رکھتا ہے اعتدال — غم و غصہ ہو، خوشدلی یا ملال
نہیں اُس کو پروا کچھ ان چیزوں کی — جو اوروں کی ہیں وجہ آسودگی
غریبوں سے کرتا ہے جو سلوک — سمائے نہ آنکھوں میں شانِ ملوک
نہیں خوردہ گیری کی عادت جسے — مروت جسے ہے، مودت جسے
مصیبت کے ماروں کا ہمدرد ہے — اور اپنے عزائم میں پامرد ہے

اِس میں کچھ شک نہیں کہ مترجم کا دل اس فلسفۂ علم و عمل سے متاثر ہے ۔جو گیتا میں بیان کیا گیا ہے ، میرا علم سنسکرت کا بہت محدود ہے ۔ اور میں اُن ادبی خوبیوں سے پوری طرح متاثر نہیں ہوں جو اصل گیتا میں پائی جاتی ہیں ۔ ترجمے کی خوبی یہ ہے کہ ترجمہ معلوم نہ ہو اور اصل تصنیف کا طرز اُس میں نمودار ہو ۔ چنانچہ مرزا صاحب کے اس ترجمے میں جس کے متعلق میں نے یہ چند الفاظ لکھے ہیں ۔ یہ خوبی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے ۔ میں گیتا کے کسی ایسے ترجمے سے واقف نہیں جس میں ادبی لطافت حکیمانہ مضامین کے ساتھ پوری طرح سے رلی مِلی ہو ۔ مرزا صاحب کے ترجمے میں یہ خوبی موجود ہے ۔ پنجاب کے ہندو سنسکرت سے بہت کم واقف ہیں ۔ اور میں یقین کرتا ہوں کہ اکثر ہندو مسلمان اس ترجمے سے پوری طرح مستفید ہوں گے ۔ مرزا صاحب نے اعلیٰ درجہ کی خدمتِ خلق کی ہے جس کی اُمید ہے کہ پبلک قدر کرے گی ؛

(راجہ) نراندر ناتھ

دیباچہ

اس مقدس کتاب بھگوت گیتا کے معنی ہیں۔ جس کو بھگوان نے مرشدِ کامل کی شکل میں نمودار ہو کر کہا یا جس میں بھگوان کا راز گایا گیا۔ یہ کتاب نہیں بلکہ انمول رتنوں کی مالا ہے۔ جس کے پہننے یعنی عمل کرنے سے پھر کچھ جاننے کرنے اور پانے کی خواہش نیست و نابود ہو جاتی ہے۔

گیتا سب شاستروں اور خاص کر اہلِ ہنود کی مقدس وید کی جو الہامی سمجھی جاتی ہے روح ہے۔ تھوڑے الفاظ میں پورا مطلب درج کیا ہے یعنی سمندر کو کوزے میں بند کیا ہے۔ جس سے ہر شخص لافانی ترقی کر سکتا ہے اور خودی کو کھو کر خدا سے وصل اور یکتائی کے درجے کو پہنچ سکتا ہے۔ جہاں ہر زحمت اور کلفت سے نجات اور آنند یعنی خوشی، کامل لافانی اور بے زوال کی حصولیت ہے۔

اِس مقدّس کتاب میں سات سو شلوک، اٹھارہ ادھیائے ہیں جو تین برابر حصّوں یعنی کرم، بھگتی اور گیان میں منقسم ہیں۔ ہر شخص کے دل میں سوائے یوگ بھرشٹوں کے جن کا ذکر چھٹے ادھیائے کے ۴۱ - ۴۲ شلوک میں ہے۔ تین عیوب ہوتے ہیں۔ یعنی کدورت، اضطراب اور حجاب۔ ان تینوں عیوب کو دور کرنے کی تدابیر یکے بعد دیگرے ہر حصّہ کے چھ ادھیاؤں میں درج ہیں۔ کدورت کی خاص وجہہ تعلقات جسمانی، خواہشاتِ نفسانی اور تمنائے اشیائے فانی ہیں۔ جن کا علاج نشکام کرم یوگ کی تعلیم ہے۔ یعنی فرض کو فرضِ منصبی سمجھ کر بلا ثمرہٗ فعل کی خواہش کے مکمل طور سے بجا

لانا۔ لیکن بلا حواسوں کی روک تھام اور غرض کو چھوڑے ہوئے یہ امر محال ہے، اسی لئے دوسرے ادھیائے کے ۴۷ ویں شلوک میں خاص طور سے کہا گیا ہے کہ تیرے فعل میں تو ادھیکار یا مقدرت ہے۔ لیکن ثمرۂ فعل میں نہیں ہے، ساتھ ہی اس کے یہ بھی کہدیا ہے کہ جب ثمرۂ فعل کی خواہش نہ ہوگی تو ایسا نہ ہو کہ فرض منصبی کی انجام دہی میں کوتاہی ہو یا فعل ہی کو ترک کر دے اور تیسرے ادھیائے کے پانچویں اور آٹھویں شلوک میں متنبہ کر دیا ہے کہ بنا کرم کئے کوئی لمحہ بھر بھی نہیں رہ سکتا۔ بلکہ جسم کا قائم رہنا بھی دشوار ہوگا۔ اس لئے پہلے آئینۂ دل کی صفائی اور بعد ازاں دنیا کی بھی اور عوام کی تقلید کے لئے مثال پیدا کرنا اپنے فرض منصبی کو ضرور ادا کرنا ہے، یگیہ دان، "تپ" کو بھی نہ چھوڑنا چاہیئے، یگیہ میں خاص "جپ" ہے، "تپ" میں حواسوں کو قابو میں رکھنا اور حق اور باطل کی تمیز پر غور کرنا اور دان میں مستحق حاجت مندوں کی حاجت روائی اپنی مقدرت اور قابلیت کے خیال سے زیادہ بہتر قرار دیئے گئے ہیں، من جو سب حواسوں کا راجہ ہے اور جس کو قابو میں کئے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔ اُس کو قابو میں کرنے کے لئے چھٹے ادھیائے کے ۳۵ ویں شلوک میں ویراگ اور ابھیاس کا ذکر کیا ہے، ویراگ کی ابتدا آدمی کو دُنیا سے ہٹاتی ہے اور اس کی انتہا معراج پر پہنچاتی ہے۔

جب دل کا آئینہ زنگ کدورت سے پاک ہو جائے۔ لیکن اضطراب باقی رہے تو اس کے لئے سب طرف سے دل کو ہٹا کر ایک مرکز پر قائم کرنے کے ذرائع دوسرے حصے میں بتلائے ہیں۔ اسی کو ابھیاس کہتے ہیں۔ مختصر طور پر بارھویں ادھیائے کے آٹھویں سے بارھویں شلوک

میں بیان کر دیئے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اس کے کیا خاصیتیں اپنے میں پیدا کرنی چاہئیں وہ ۱۳ - ۱۹ اشلوک میں درج ہیں۔ جن کے بغیر یکسوئی قلب طالبِ حق کو دشوار ہوگی۔ لیکن واضح رہے کہ ع

عشق بن یہ ہنر نہیں آتا!

مثل بھی ہے کہ "لگن لگی نہیں اور چیز ملی نہیں"۔ عشق ہوا نہیں کہ معشوق ملا نہیں، لیکن عشق حقیقی یا لگن بلا اُس کی ذات، صفات اور طاقت کو جانے ہوئے پیدا ہونا دشوار کیسا ناممکن ہے، اسی لیئے دسویں اور گیارھویں ادھیائوں میں خاص کر بھبھوتیوں میں قدرت کردگار کا ذکر کیا گیا ہے۔ عاشقِ صادق وہی کہا جا سکتا ہے جو اپنے معشوق پر نثار ہو اور نثار ہونے کے لیئے ایک عشق دوسرے کامل یقین اس امر کا ہونا کہ اس سے اپنی بہبودی یعنی طلب کی تکمیل ضرور ہوگی۔ نہائت لازمی ہیں۔ جہاں یہ دونوں اوصاف آگئے تو نثار ہونے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہ سکتا۔ جہاں عشق کا سمندر دل میں اُمڈا تو جو کچھ کدورت دل میں رہی سہی ہے وہ بھی اُس کے ریلے میں بہ کر یکسوئی حاصل ہوگی۔ یکسوئی حاصل ہوتے ہی نورِ مطلق اور سرور کا چمکارا ملے گا، تب نثار ہونے میں کچھ دیر نہ لگے گی۔ نثار ہوتے ہی کرتا پن یعنی خودی کی بیخ کنی ہو جائیگی جب خودی نہ رہی یعنی میں بھی نہ رہا تو "میرا پن" کیسے رہ سکتا ہے۔ اور جب میرا پن یعنی کسی چیز سے دنیا میں تعلق ہی نہ رہے گا۔ تو رغبت اور نفرت جو موجب تکلیف دہی ہیں وہ بھی نہیں رہ سکتیں اور دل مضطرب نہیں ہو سکتا، کچھ کا کہنا ہے کہ رغبت اور نفرت ہی سے دنیا قائم ہے۔ جس کی نظر میں یکسانیت ہے۔ اس کے لئے دنیا کا ہونا

نہ ہونا برابر ہے ۔ رباعی

آنکھوں میں تری غبار پندار کا ہے
مانع یہی معشوق کے دیدار کا ہے
کر سرمۂ معرفت سے پہلے اسے دور
پھر دیکھ کہ جلوہ ہر طرف یار کا ہے

جو کچھ دیر ہے وہ کدورت اور اضطراب کے دور کرنے اور نثار ہو کر خودی کے مٹانے میں ہے ۔ خودی گئی اور خدا سے واصل ہو کر یکتائی کو پہنچا ۔ جب وہاں پہنچا ۔ تب اپنی خبر بھی نہ رہے گی ۔ "نہ ہم نہ تم ، دفتر گم" کا مضمون ہو جائے گا ۔ پردۂ حجاب دور ہو کر مشاہدہ ذات ہو جائے گا ۔ جب سوائے ایک کے دوسرا رہے گا ہی نہیں تو کس سے خوف ہو ، کیا رنج ہو اور کس سے الفت ہو ۔ کیونکہ دوتائی کے نہ ہوتے خوف ، رنج اور الفت ہو ہی نہیں سکتے ۔ اور یکتائی میں خوشی کامل ، سرور مطلق اور سکون لازوال میں شبہ ہی کیا ہو سکتا ہے ۔ جو معراج ہے اور جس پر پہنچنا ہے ؂

تیرھویں ادھیائے میں ۷ ۔ ۱۱ شلوک تک گیان کے بیس سادھن یا ذرائع اور سولھویں ادھیائے کے پہلے ڈھائی شلوک میں ۲۶ صفات ملکوتی (دیوی سمپت) کا بیان ہے ۔ اُن کے عمل میں کافی دسترس ہونے سے روحانی ترقی میں پوری مدد ملتی ہے ، ساتھ ہی سولھویں ادھیائے میں شیطانی سیرت یعنی اسُری سمپت کا ذکر کیا گیا ہے کہ ان سے ہر بشر کو بچنا چاہیئے ۔ چودھویں ، سترھویں اور اٹھارویں ادھیائے کے ایک جزو میں جو تین گنوں کا بیان ہے ۔ اُن میں تم اور رج کو چھوڑ

کرستو کو اپنے میں پیدا کرنے سے منزلِ مقصود پر پہنچنے میں بہت مدد ملے گی۔ اور کمال تو تبھی حاصل ہوگا جب ستو کو بھی تیاگ کر تینوں گنوں سے پار ہو جائے گا۔ یعنی جہاں گُن کیا دوتائی کا نام و نشان بھی نہ رہے، اس درجہ پر پہنچنے کے لئے پہلی ریاضت علاوہ اُس کے جو اوپر بیان ہوا، یہ ہے کہ بیٹھتے اٹھتے، سوتے جاگتے، کھاتے پیتے یہی خیال طبیعت پر حاوی رکھے کہ یہ دنیا سپنے کی طرح جھوٹی ہے اور حقیقت میں اس کا ناظر سچا ہے۔ بتدریج انسان وہ استغراق حاصل کرے گا کہ دنیا اس کو خواب نظر آنے لگے گی اور اپنی ذات کو وہ اس خواب کا دیکھنے والا جاننے لگے گا۔ اس سے بھی ترقی کر کے وہ اس مرتبۂ انتہائی کو پہنچے گا کہ دنیا کی دید بند ہو جائے گی اور وہ اپنے آپ کو بے مثال اور بے نظیر آنند کا سمندر محسوس کرے گا، تب اُس کا کلام یہ ہوگا

رباعی ؎

دنیا ہے کہاں اور اس کا آرام کہاں
وہ فکر کہاں گئی وہ آلام کہاں
جس موج سرور میں ہوں میں غرق اُس کا
آغاز کہاں ہے اور انجام کہاں

گیتا میں کرم یوگ جس میں بھگتی اور یوگ دونوں شامل ہیں اور سانکھیہ یوگ کا بیان دوسرے ادھیائے سے شروع ہوا ہے اور اخیر تک رہا ہے لیکن اٹھارہویں ادھیائے کے ۶۵ اور ۶۶ شلوک میں کل گیتا کا خلاصہ دے دیا ہے یعنی کرم یوگ کا نچوڑ ۶۵ میں اور سانکھیہ یا گیان یوگ کا ۶۶ میں ہے۔ پہلے کرم یوگ کر کے گیان یوگ میں داخل ہونے کی قابلیت پیدا کرے۔ تب اُس میں داخل ہو، یہی تعلیم ارجن کو دی اور اس سے

کرم کرایا۔ یہ تعلیم ارجن کیا سب کے لئے ہے ورنہ تکمیل کو نہ پہنچے گا۔ دوسرے ادھیائے کے ۵۵-۷۱ شلوک میں قائم العقل کے اوصاف بیان ہوئے ہیں ان کو اپنے میں حاصل کر کے مکمل شخص بننا چاہیئے۔

اگر گیتا شاستر کو شرناگت یوگ کا بنانے والا سمجھا جائے جس میں کرم بھگتی اور گیان سب شامل مانے جائیں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ دوسرے ادھیائے کے ساتویں شلوک سے گیتا شروع ہوئی اور ساتویں ادھیائے کے چودہ اور پندرھویں ادھیائے کے چوتھے اور اٹھارویں ادھیائے کے باسٹھویں شلوک میں شرن کا اشارہ ہے اور اٹھارویں ادھیائے کے چھیاسٹھویں شلوک میں جا کر اس کی تعلیم ختم ہو گی۔ لیکن شرن کے تین بھاؤ اور چھ لکھشن جانے بغیر اس کا اصلی مطلب نہ کھلے گا نہ کوئی عمل میں لا سکے گا۔ چھ لکھشن یہ ہیں۔ شاستر یعنی شریعت یا حدیث کے مطابق :-

(۱) اچھے کرم کرنا (۲) برے کرموں کو نہ کرنا (۳) بھگوان یا خدا میری حفاظت کرے گا، اس پر کامل یقین رکھنا (۴) راضی برضا رہنا (۵) اپنے آپ کو خدا پر نثار کر دینا (۶) خودی کا کامل ترک یعنی تیاگ کرنا۔

تین بھاؤ جنہیں کرم، بھگتی اور گیان بھی کہہ سکتے ہیں یہ ہیں :-

(۱) میں اس کا جب تک خدا کو جانا نہیں۔

(۲) جب کچھ پہچان ہوئی تو میں تیرا یا وہ میرا۔

(۳) جب آشنائی ہو کر یکتائی کے درجے کو پہنچ گیا تو میں اور وہ ایک۔

اس حالت کے بعد کلام یا گویائی کا خاتمہ ہے اور اس کے آگے ایک خاموشی ہے یعنی پھر کون کہے، کس سے کہے، کیوں کہے، کیا کہے۔ جب دریا سمندر میں جا کر مل جاتا ہے تو سمندر کی خاموشی اور سکون کی حالت کو پہنچ جاتا ہے،

تب اُس کو نہ کوئی علیحدہ کر سکتا ہے نہ علیحدگی کا کوئی نام یا نشان رہ جاتا ہے، یہی آخری معراج یا کمال ہے جس پر ہر شخص کو پہنچنا ہے اور اس کے ذرایع اِس مقدس کتاب میں بیان ہوئے ہیں۔

مُبارک ہے وہ شخص جو اس متبرک کتاب کا مطالعہ کر کے اس کے معنی و مطالب پر غور و خوض کے بعد مکمل طور پر عمل کر کے روحانی ترقی کے بام بلند پر چڑھ جائے یعنی یکتائی حاصل کرے وہ سجدے کے لائق ہے، خودی چھوڑ اور خیالِ یار میں استغراق پیدا کر۔ سو بات کی ایک بات یہ ہے ؎

دیدار یار آج ہی ہو جائے گا تجھے پر شرط یہ ہے آگ ہو دل میں لگی ہوئی

اور آخری دعا یہ ہے!

رباعی

گیتا جو پڑھیں اثر کی وہ شاد رہیں![2]
بے فکر رہیں، خوش رہیں آباد رہیں!
ہو گیان کی برکت سے اُنہیں یہ توفیق
رہتے ہوئے بھی جہاں میں آزاد رہیں

گنگا شنکر (جج ریٹائرڈ)

دکھی کیش۔

---

[1] زباں قفل دہن ہو گی حقیقت آشنا ہو کر
کہ درس خامشی کی ابتدا باریک بینی ہے — اثر از بہاراں

[2] اثر اس لطفِ خاص کا شکریہ کن الفاظ میں ادا کرے۔

تعارف

ابتدائے آفرینش سے انسانی تجربہ اس امر کا شاہد ہے کہ ہر فردِ بشر کی پیہم جد و جہد زندگی کا واحد مقصد یہ ہے کہ اسے راحتِ ابدی نصیب ہو۔ حیاتِ انسانی کے کسی شعبہ کو لیجئے آپ کو اس کی تہ میں یہی ایک راز کار فرما دکھائی دیگا سفر ہو یا حضر۔ جلوت ہو یا خلوت۔ حاکم ہو یا محکوم۔ عالم ہو یا جاہل۔ ہر ذی جان اس سرمدی کے تعاقب میں سرگرداں ملے گا۔ لیکن کیا اس ہمہ گیر جستجو کے بعد ہر انسان یہ کہنے کا دعوے کر سکتا ہے۔ کہ وہ شاہدِ مقصود سے ہمکنار ہونے میں کامیاب ہوا ہے عموماً یہی جواب ملتا ہے کہ نہیں۔ بلکہ مرض بڑھتا گیا۔ جوں جوں دوا کی۔ اس پہ قدرتاً سوال پیدا ہوتا ہے کہ اِس سعی لاحاصل کا سبب کیا ہے۔ کیا راحت ابدی محض ایک موہوم شے ہے یا اگر اس کی ہستی ہے تو کیا وہ انسان کی رسائی سے پرے ہے۔ فلسفۂ حیات کے بحرِ ذخار کے غواص اپنے طویل مطالعہ اور تجسس کی بنا پر اس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ کہ اس دائمی سرور کی ہستی تو یقیناً ہے لیکن اس کی تلاش مادی کائنات کی ناپائدار و تغیر پذیر چیزوں میں ایسی ہی اکارت ہے۔ جیسا کہ سراب سے تشنگی کی آگ بجھانے کی امید باندھنا یا افعی کے زہر سے امرت کی توقع رکھنا۔ اُن کا قول ہے کہ انسان حقیقی راحت کی جستجو میں اپنی قیمتی زندگی کائنات کی ہر لحظہ تغیر اور اضداد کے دور میں گھومنے والی چیزوں سے وابستگی پیدا کرنے میں نہ ضائع کرے۔ البتہ اگر اِس لازوال نعمت کے پانے کی سچی تڑپ ہے تو وہ اسے اس قائم بالذات سرورِ کل ہستی میں پائے گا۔ جس کی فطرتِ ازلی میں کائنات کی ہر شے فلم کی تصویر کی مانند مسلسل باقاعدہ

سے بقا اور فنا میں عیاں اور نہاں ہو رہی ہے اور جس علم کل ہستی میں انسانی دل ہمدردی اور یگانگت کا ایک ایسا فانوس ہے۔ جو قالب کی قندیل سے چار دانگ عالم کو اپنی ضیا پاشیوں سے بقعہ نور بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ لیکن یہ امر ہر انسان کے اپنے اعمال پر موقوف ہے کہ اس کا دل اپنے ناپاک کردار سے محض ٹمٹماتا ہوا چراغ سحری ہو کر رہ جائے یا اپنے اعمال حسنہ کی روح پرور بصیرت افروز شعاعیں لامحدودیت میں بکھر کر کائنات کے ہر گوشہ سے جہالت اور گناہوں کی تاریکی کو علم و سرور کے نور میں بدل دیں اور دنیا کو آماجگاہ جنگ و جدل، رنج و محن کی بجائے۔ امن و آشتی و محبت رواداری کا گہوارہ بنا دیں۔

سری گیتاجی کا فرمان ہے کہ جہاں تنگ دل۔ خود غرض انسان نہ صرف اپنے لئے بلکہ ہر دو عالم کے لئے باعث ننگ ہے وہاں کشادہ دل فیاض انسان کا وجود سرچشمۂ فیض و کرم ہے۔ اس لئے اگر وہ دنیا کو ماتم کدہ رنج والم سے بزم شادمانی وکامرانی میں بدلنے کا متمنی ہے تو اسے دل کی وسعتوں کو لامحدود کرنا ہی اپنی زندگی کا منتہا مقصود قرار دینا ہوگا اور اس کے حصول کے لئے ہر لمحہ کوشاں رہنا ہوگا۔

لیکن سری گیتاجی کے مطابق کسی انسان کی وسیع الخیالی اور اخلاق کا معیار اس کی علمیت و فضیلت ہی نہیں ہے۔ بلکہ اس کی صحیح پرکھ کی کسوٹی اس کے اعمال ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر محض عالم و فاضل ہونا ہی انسان کو انسانیت کے کمال پر پہنچانے کے لئے کافی ہوتا۔ تو ارجن تعلیم و تربیت کے اعتبار سے یکتائے روزگار تھا۔ وہ دل و دماغ کے جملہ اوصاف حمیدہ سے متصف تھا اس میں اخلاق۔ اخوت، حب وطنی۔ شجاعت۔ قربانی و ایثار کے جوہر

بدرجہ اتم درخشاں تھے۔ مگر کوئی انسان اسوقت تک مکمل کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا ہے، جب تک وہ اپنے علم کو عمل کا جامہ پہنائے اور ان میں ہم آہنگی اور ہمسازی پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہو۔ کارزارِ حیات میں جب ارجن کی آزمائش کا موقعہ آیا تو وہ پورا نہ اُترا۔ جذبات و وابستگی کی ضررین کی گرداب میں چکر ایا ہوا ارجن اپنے اور پرائے کی محبّت و نفرت سے مغلوب ہو گیا اور اپنے فرائضِ منصبی کو فراموش کر بیٹھا بلکہ بیدل ہوکر ان کی انجام دہی سے منحرف ہو گیا۔ اگر کرشن سا راہنما ایسے اڑے وقت میں اس کی دستگیری کے لئے موجود نہ ہوتا۔ تو اغلب تھا کہ ارجن ہمیشہ کے لئے محرومی اور ناکامی کا شکار ہو کر قعرِ مذلت میں غرقاب ہو جاتا۔ سری کرشن نے شکستہ دل ارجن کو ایسے نازک موقعہ پر جس نشکام کرم یوگ کا لائحہ عمل دکھا کر اس کی راہنمائی کی اور اسے اوجِ کمال پر پُہنچایا۔ وہ سری گیتا جی کا مضمون ہے۔ اس طریقہ عمل میں فلسفۂ زندگی کا جو رازِ نہاں ہے۔ وہ انسان کو کامرانی اور شادمانی کی لازوال دولت سے مالامال کرنے کا مجرب اور حکمی نسخہ ہے۔ نشکام کرم یوگ سے مراد ہے کہ انسان ذاتِ باری میں قایم العقل رہتے ہوئے اپنے تمامتر فرائض زندگی کائنات کی بہبود کے لئے بلاخواہش ثمر انجام دینے کا عادی ہو جائے۔ اس میں خودی کا شائبہ تک نہ ہو۔ اسے ماسوائے ذاتِ حق کے کوئی دوسری چیز دکھائی ہی نہ دے۔ اس کو ہر لمحہ ایسا محسوس ہوتا رہے کہ کائنات کے عالمگیر عمل کی محرک صرف مشیت ایزدی ہے اور اس کو اِس عمل کی تکمیل میں ذاتِ باری نے اس کے اعمال سے بنے ہوئے میلانِ طبع کے مطابق چند مخصوص فرائض کی انجامدہی کے لئے آلہ کار منتخب کیا ہے۔ اگر وہ دل کی یہ کیفیت پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ تو بقول شاعر۔ دل بیار و دست بکار۔ وہ فطرتِ ازلی سے ہمساز

ہو کر بے تکان و بلا رنج مکمل سکون قلب سے زندگی کی منزلیں طے کرتا جائے گا اس کے ہر دم سے مشام عالم معطر و مسرور اور اس کی ہستی سے کائنات بزم نشاط و طرب بن جائے گی۔ اس کے دل کی وسعتیں لامحدود ہو کر ذاتِ حق میں سما جائیں گی اور اس کے حواس خمسہ ماسوائے ذات حق کے کسی اور شے کو محسوس کرنے سے عاری ہو جائیں گے۔ ایسا سلیم العقل و مستقل مزاج خود فراموش۔ خدا شناس انسان۔ محبت۔ آشتی۔ ہمدردی اور حلم کا اتھاہ سمندر ہے۔ جس کے دل کی حق شناس ہمواری اور سکون کو جذبات کے طوفان متلاطم کرنے سے بے بس ہیں۔ وہ صراطِ مستقیم پر بیدھڑک چلنے کا اہل ہے۔ وہ یہ کہنے کا حق رکھتا ہے۔ ؎

من تو شدی من تو شدم تو تن شدی من جاں شُدم
تاکس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

نشکام کرم یوگ کے پاکیزہ مضمون کو خوبصورتی اور آسانی سے نبھانے کیلئے شریمد بھگوت گیتا میں اچھوتے اور روح نواز خیالات کو ایسے حسن بیان اور دلکش انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ جو اس کی تازگی اور شگفتگی کو ہزار ہا سال سے اپنی اعلیٰ خوبی میں سنبھالے رکھنے کے ضامن ہیں۔

نشکام کرم یوگ کس اصول پر مبنی ہے۔ اس کے متعلق گیتا کا ارشاد ہے کہ کائنات ایک عالمگیر عمل طبعی یا مہا یگیہ ہے جس میں ہر شے خود بخود کائنات کو برقرار رکھنے کے لئے سرگرم عمل ہے اور انسان ہی اس ازلی عمل طبعی کا ایک جزو لاینفک ہے۔ یہ عمل ایک بے لاگ ذاتِ باری کی تین طبعی حالتوں میں خاص کمی بیشی کی نسبت سے ظہور پذیر ہوتے رہنے کا نتیجہ ہے۔ اِن حالتوں کو شاستروں کی اصطلاح میں رج۔ ست۔ تم یا برہما۔ وشنو اور شِو

کہا جاتا ہے۔ اُردو میں ان کو جوش جلال اور جہل (جمود) یا ارتعاش ارتقا۔ انحطاط سے تعبیر کرنا موزوں ہوگا۔ یہ تینوں حالتیں آپس میں ہمیشہ ملی جُلی رہتی ہیں اور لازم ملزوم ہیں۔ اس عمل میں ہر علت معلول میں اور ہر معلول علت میں لگاتار بدلتی رہتی ہے۔ بقا کے بعد فنا اور فنا کے بعد بقا کے عمل و ردِعمل کا سلسلہ جاری ہی رہتا ہے۔ اس لئے گیتا کا فیصلہ ہے کہ عمل سے بالطبع کسی بھی انسان کو راہِ مفر نہیں۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ انسان کے رنج و راحت کا موجب اس کے اعمال ہیں۔ لیکن مندرجہ بالا کرم فلاسفی کے نظریہ سے دیکھنے پر معلوم ہوگا کہ رنج و راحت عمل میں نہیں ہے۔ بلکہ وہ انسان کی خواہش میں ہے۔ جو عمل کے معاوضہ یا ثمر کی متلاشی ہے اور یہ خواہش اس پندار میں پنہاں ہے۔ جس کا پردہ روح پر رجوگن یا جوش کی وجہ سے پڑ جاتا ہے اور جس سے انسانی روح اپنے آپ کو کائنات میں مشیتِ ایزدی کی بجائے فاعل تصوّر کر لیتی ہے اور اپنے فرضی اعمال سے ثمر کی توقع باندھ لیتی ہے۔ جس کے پورا ہونے یا نہ ہونے سے عارضی خوشی و غم محسوس کرتی رہتی ہے۔ لیکن جب انسان علم و عرفان سے اپنی اصلیت کو بھانپ لیتا ہے تو اسے عین الیقین ہو جاتا ہے کہ کائنات میں عمل اور اس کا ثمر دونوں انسان کے اختیار سے باہر ہیں۔ اور یہ دونوں مشیت کے ہاتھ میں ہیں۔ اس لئے وہ عمل کے ترک کا جھوٹا قصد کرتا ہے اور نہ اس کے ثمر کی موہوم امید باندھتا ہے۔ بلکہ ذاتِ حق کے جلوہ سے ہر وقت سیر چشم رہ کر کائنات سے ہمساز و ہم نوا ہو کر لگاتار عمل میں سرشار رہتا ہوا اور راحتِ ابدی سے دلشاد ہوتا ہے۔ جو نشکام کرم یوگ کا ثمر ہے اور جس کے لئے شری گیتا جی

ع صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

اثر صاحب نے اپنے نغمۂ جاوید میں اردو دان اصحاب کیلئے شریمد بھگوت گیتا کے فلسفیانہ رموز معرفت کو سادہ اور شستہ زبان میں پیش کیا ہے اور اصل کی خوبی ترجمہ میں قائم رکھی ہے۔ یہ کتاب کتب خانۂ عالم میں ایک بیش قیمت اضافہ ہوگی؛

پنڈت گنگا ناتھ شرما بی۔ اے۔ جموں

تشریحات ۔ کتاب میں سانکھیہ اور یوگ کا ذکر تشریح طلب ہے۔ سانکھیہ اور یوگ ہندوؤں کے چھ شاستروں میں سے ہیں۔ سانکھیہ کے بانی کپل منی رشی کے مطابق کائنات کا وجود فطرت ازلی اور روح کے ملاپ سے ہے جو پیدائش اور فنا کے دور میں سے مختلف نام، روپ، صفات اختیار کرتی ہوئی لگاتار گھومتی رہتی ہے۔ فطرتِ ازلی با عمل، باصفات، بے شعور، تغیر پذیر لیکن لافانی ہے اور روح بے عمل، بلا صفات، ذی شعور، غیر مبدل اور لافانی ہے اور محض فطرت ازلی سے لگاؤ ہونے کے سبب اس کے لگاتار تغیر سے متاثر ہو کر سکھ دکھ محسوس کرتی ہے لیکن جب انسانی روح اپنی حقیقت سے باخبر ہو جاتی ہے تو وہ فطرت ازلی یا مادہ کی صفات سے اثر پذیر نہیں ہوتی۔ اس وقت اس کی پرسکون حالت کو نروان کہتے ہیں۔ گیتا جی میں اس کا ذکر اس سے آگے بڑھتا ہے۔ اس کے مطابق فطرت ازلی اور روح کا منبع اور مرجع ایک ناقابل بیان ذات ہے جو مسبب الاسباب، قائم بالذات، قادر مطلق، عقل کل اور محیط کل ہے۔ جب انسانی روح زہد و ریاضت سے اس ذات میں فنا ہو جاتی ہے تو اسے کائنات کے ہر عمل کی محرک اس ذات کی فطرت ازلی دکھائی دیتی ہے۔ اس حالت کو برہم نروان کہا گیا ہے۔ یوگ کے بانی پاتنجل کے مطابق انسان زہد و ریاضت سے حواس قابو میں لا کر مکمل یکسوئی سے ذات حق میں واصل ہو جائے۔ پھر اسے عمل سے کوئی سروکار نہ ہوگا۔ بقول گیتا جی عمل سے کوئی بے نیاز نہیں اس لئے انسان کو چاہیئے کہ ذات حق میں واصل ہو کر بھی بلا خواہش ثمر کائنات کی فلاح و بہبود کے لئے فرائض ادا کرتا رہے۔ اسے نشکام کرم یوگ کہا گیا ہے؛

(گنگا ناتھ شرما)

عرضِ مترجم

میں نے بی۔ اے میں جو مضامین لئے اُن میں فلسفہ بھی تھا۔ اسی سلسلے میں گیتا کا مطالعہ کیا اور اس کے بلند مطالب و مقاصد نے اپنا گرویدہ بنا لیا۔ بعد ازاں گیتا کے متعدد ترجمے اور شرحیں پڑھتا رہا لیکن کبھی اس طرف خیال بھی نہ گیا کہ اُردو میں اس کے ترجمے کی جسارت کروں۔ ۴۳ء کے موسمِ بہار میں دورانِ قیام سرینگر (کشمیر) لالہ جویلی رام صاحب چیف سیکریٹری ریاست جموں و کشمیر نے جن سے اکثر علمی و ادبی گفتگو ہُوا کرتی تھی بسبیلِ تذکرہ کہا کہ اگر گیتا کے فلاں ادھیائے کا اُردو میں ترجمہ کرو تو بہت اچھا ہو۔ میں نے اپنے عجز کا اظہار کیا۔ بات آئی گئی ہوئی۔ ایک دن گیتا پڑھ رہا تھا کہ لالہ صاحب کی فرمائش کا دھیان آیا، اُس وقت تک بھول چکا تھا کہ کس ادھیائے کے ترجمے کو کہا تھا، پہلے ادھیائے سے ابتدا کی، توفیق رفیق ہوئی اور شعر نکلنے لگے، اگر حافظہ غلطی نہیں کرتا تو پہلا ادھیائے ایک ہی نشست میں ختم ہو گیا اُسی کے ساتھ یہ کہہ دینا بھی ضروری ہے کہ آگے بڑھ کر بعض مقامات ایسے آئے کہ گھنٹوں سر کھپانے پر بھی ایک مصرعہ موزوں نہ ہوتا تھا۔ لیکن پھر سرچشمہ فیض جاری ہو جاتا اور میں بقدرِ ظرف سیراب ہوتا۔ چھ سات ہفتوں میں ترجمہ ختم ہو گیا۔ ایسے حضرات کو جو گیتا کی تعلیم نیز سنسکرت زبان سے واقف تھے ترجمے کے اکثر حِصّے سُنائے، انہوں نے نہ صرف ہمّت بڑھائی بلکہ اہم اور مفید مشورے بھی دیئے، ایسے تمام حضرات کا شکر گزار ہوں۔ اِن میں

سے بعض کے اسمائے گرامی یہ ہیں :-

لالہ حویلی رام صاحب ٭ پروفیسر آر، سی، پنڈتا ٭ پنڈت تاراچند ترسل ٭ پروفیسر جے لال کول (اب میرپور کالج کے پرنسپل ہیں)، راج گرو پنڈت بالکرشن جی شاستری۔ پنڈت گنگاناتھ مہتمم دھرم ارتھ ڈیپارٹمنٹ۔ سب سے آخر لیکن سب سے زیادہ اپنے محترم دوست گنگا شنکر جی ریٹائرڈ جج ساکن رگھی کیش کا زیربار احسان ہوں جنہوں نے دنیا سے کنارہ کش ہونے کے باوجود مجھے گیتا کے بہت سے باریک نکات بتائے۔ جن کی روشنی میں ترجمے کی مزید صیقل کی گئی اور مطالب زیادہ واضح ہو گئے ٭

اہلِ نظر کو اندازہ ہو گا کہ میرا ترجمہ لفظی ترجمہ نہیں ہے بلکہ ہر ادھیائے کا مفہوم آگیا ہے۔ اور اُس پر اُن اثرات اور خیالات کا اضافہ ہے۔ جو گیتا کے مطالعہ سے میرے دل پر مرتسم ہوئے۔ اس عمل کا یہ نتیجہ ہُوا ہے کہ اکثر شلوکوں کی ترتیب بدل گئی ہے، مقدم موخر اور موخر مقدم ہو گئے ہیں۔ جن حضرات کے اسمائے گرامی اوپر درج کئے گئے اُنہوں نے مُجھے اطمینان دلایا کہ یہ اضافے گیتا کی تلقین کے منافی یا اُس سے متبائن نہیں ہیں ٭

کرنل سر کیلاس نارائن ہاکسر سی، آئی، ای اور راجہ نراندر ناتھ صاحب بالقابہ کا ممنونِ کرم ہوں کہ انہوں نے ترجمے کو اپنی بیش قیمت آرا سے مزین فرما کر میری عزت بڑھائی ٭

آخر میں گنگا شنکر جی کا دوبارہ شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اُنہوں نے نہ صرف میری ہدائت کی۔ بلکہ ایک پُر مغز و عالمانہ دیباچہ تحریر فرما کر ترجمے کی بہت افادیت میں اضافہ کیا ٭

اثر

اصل ترجمہ سے پہلے دو نظمیں اظہارِ خلوص و عقیدت میں اور
ایک نظم کہ مذہب کا تصور کیا ہونا چاہیئے اور ایک غزل شامل ہیں
گیتا کا احترام کے ساتھ مطالعہ ان کا ماخذ ہے؛

اثرؔ

کرشن مُرلی

ترا نام پیارا، ترا بول بالا! تری پریت ہے سُمرن! تری یاد ہے مالا
ہُوا من کے درپن میں تجھ سے اُجالا وہ دیوکی کی آنکھوں کا تارا دلارا
کمل نین، امرت ہے جن کا اشارا
سری کرشن موہن منوہر کنہیا بہاری مُراری مدھر مرلی والا

جہاں ہر طرف آگ بھڑکی ہوئی تھی جہاں خود قضا پھرتی تھی سہمی سہمی
جہاں بجلیوں پر بھی گرتی تھی بجلی وہاں اس طرح روپ تو نے دکھایا
دوئی کو مٹا کر خودی کو اُبھارا
سری کرشن موہن منوہر کنہیا بہاری مراری مدھر مُرلی والا

جہاں فلسفے کے قدم ڈگمگائیں جہاں ہوش بدھ مانوں کے غوطے کھائیں
جہاں سورماؤں کے دل ڈوب جائیں وہاں شبہ ارجن کا تو نے مٹایا
حقیقت کے رستے پر اس کو لگایا!
سری کرشن موہن منوہر کنہیا بہاری مراری مدھر مرلی والا

وہ تعلیم جو سر بسر راستی ہے صداقت کی اک روح دوڑی ہوئی ہے
نشاط ابد حاصل زندگی ہے وہ ربانیت نام ہے جس کا گیتا!

جسے جگ نے مانا جسے جگ نے گایا
سری کرشن موہن منوہر کنہیا بہاری مراری مدھر مرلی والا

جو ایشور میں جینا تو ایشور میں مرنا نرائن کا جیون میں اُپکار کرنا!
صدا اُس کی سُننا، دم اسکا ہی بھرنا نہیں ہیں بھی اپنا تو کیسا پرایا
سبھی پا گیا جس نے یہ بھید پایا
سری کرشن موہن منوہر کنہیا بہاری مراری مدھر مُرلی والا

ترے فیض سے علم کے چشمے اُبلے محبّت کا خورشید نکلا گھٹا سے
بھکاری اَثر کی بھی گردھر خبر لے فریب من و تو سے آزاد کردے
کمنڈل کو دل کے سپجنتا سے بھر دے
سری کرشن موہن منوہر کنہیا بہاری مراری مدھر مُرلی والا

آجا

اے گلبنِ رعنائی اے رشکِ بہار آجا
اک جانِ ستمکش کو آجائے قرار آجا
وا تیری تمنا میں آغوشِ محبت ہے
خود اپنی محبت سے ہونے کو دوچار آجا
تتلاتے ہوئے غنچوں کی سادہ لفائیں
پھولوں کی ملاحت میں اے طرفہ نگار آجا

اے برج کے لال آجا
اے میرے دیال آجا

ہنسی کے مدھر گیتوں اور تان کے پلٹوں میں
ہنستا ہُوا، اٹھلاتا، گلشن بکنار آجا
بدمست ہواؤں کو دامن سے لپٹنے دے
آنکھوں میں لئے میٹھے سپنوں کا خمار آجا
میں دل کے جھروکے سے جو وقت تجھے جھانکوں
اشکوں کے دھندلکے میں ہیں تیرے نثار آجا

اے برج کے لال آجا
اے میرے دیال آجا

مذہب کا تصوّر

ہندو ہو پارسی ہو مسلماں یا یہود
مرغوب سادگی ہو کہ رنگینیٔ شہود!
"شمع حرم ہو یا کہ دیا سومنات کا" (امیرؔ)

دانا ہو یا فقیہہ کہ مست الست ہو
باطن سے آشنا ہو کہ ظاہر پرست ہو
قائم سبب کرے نہ کرے کائنات کا

سرگشتۂ مجاز ہو یا خلوتیٔ راز
ذات و صفات میں جسے ممکن ہو امتیاز
یا ذات ہی کو آئینہ سمجھے صفات کا

عالم کو اپنے حلقے میں جبتک نہ لے سکے
پیغامِ امن سارے جہاں کو نہ دے سکے[1]
جب تک نہ دل میں درد ہو ہر ذی حیات کا

جب تک نہ ما و من کا فسانہ بھلا سکے
انساں کو ماوراکی حدوں میں نہ لا سکے
مذہب وسیلہ ہو نہیں سکتا نجات کا

---

[1] میری ایک دوسری نظم "محبت کی مرلی" کے چند شعر یہ ہیں:-

وہ پیغام امن و اماں دینے والا
رہ معرفت کا نشاں دینے والا
اُسی "برج موہن" کا نغمہ سناؤ
محبت کی ہر وقت مرلی بجاؤ

وہ نغمہ فضائیں تھیں سرشار جس سے
چھکے دشت و گلزار و کہسار جس سے
اُسی سوتے جادو کو پھر سے جگاؤ
محبت کی ہر وقت مرلی بجاؤ

وہ نغمہ کہ روحوں کو جس نے سنوارا
جنہیں "گوپیاں" کہہ کے سب نے پکارا
وہی رنگ رلیاں دوبارہ مناؤ
محبت کی ہر وقت مُرلی بجاؤ

ہوئی پاک جب روح سب رشتے ٹوٹے
مزے لوٹے اپنی صفا و ضیا کے
یہ "مایا کا منڈپ" جو ہے پہلے ڈھاؤ
محبت کی ہر وقت مرلی بجاؤ

اثر

پہلا ادھیائے

ارجن وشاد

یہ سنجے سے پوچھا دھرتراشٹر نے
کہ جب کورو پانڈے صف آرا ہوئے
کوروکشیتر کی وہ مقدس زمیں
زمیں کیسی رشکِ بہشتِ بریں
بیاں کر وہاں کا ذرا ماجرا
کہ آغاز کیونکر ہوا جنگ کا
کیا حال سنجے نے یوں آشکار
کہ گویا ہے پیشِ نظر کارزار
یہ کی عرض اے شاہِ گردوں اساس
دروھن گئے خود درونا کے پاس
گُرو سے یہ پرنام کر کے کہا
سدا بول بالا رہے آپ کا

یہ پانڈوں کی فوج گراں دیکھئے
سجاوٹ ہے کیسی، جہاں دیکھئے
حشم اور خدم کی کوئی حد نہیں
مگر پھر بھی ترتیب ہے دل نشیں
دروپد کا لڑکا ہے سالارِ فوج
جبھی تو ہے یہ شان و شوکت یہ اوج
وہ شاگرد ہے آپ کا جنگ میں
نہ کیوں ہو پھر اُستاد اس ڈھنگ میں
چپ و راست سردار ہیں جنگ جو
یہ ارجن سے وہ بھیم سے تند خُو
کمانیں ہیں کیا کیا کڑکتی ہوئی
کڑکتی ہوئی اور لچکتی ہوئی
وراٹ اور یویودھن سے خالی وقار
چیکیتان و دھرشٹکیت والا تبار
تو کنتی بھوج اور پروجیت بھی
شیبیہ اور ابھیمن دروپد جری
اُدھامنیوج اور اتوج میں
سبھی ہیں غضبناک تیوری پہ بل

ابھیمن، قوی بازو و نامدار
قریب اُس کے سہدیو ضیغم شکار
دروپد کی دختر کے فرزند بھی
جنہیں پانڈوؤں کی ہے سرکردگی
سب اُپچی بنے اور تنے بیٹھے ہیں
سنہری رتھوں میں بنے بیٹھے ہیں
چھٹی کا مگر دودھ یاد آئے گا
کہ یاور ہمارے بھی ہیں سورما
جو بے مثل ہیں آپ تو بھشم[1] فرد
جدھر جھک پڑیں ہو عدو گرد برد
کرن اور کرپ دونوں خونخوار ہیں
بڑے کلّے ٹھلّے کے سردار ہیں
وکرن اور اسوتھما سے جری
قسم جن کی کھاتی ہے خود برتری
قوی سومدت اور دیگر دلیر
نہ پایا قضا نے کبھی جن کا پھیر
جو ہر لحظہ مرنے کو طیار ہیں
باندازِ جرأت وفادار ہیں

[1] راجا دھرت راشٹر اور راجا پانڈو کے چچا تھے۔

شجاعت میں جن کا نہیں ہے جواب
صفیں اُلٹیں جب کھینچی تیغ خوش آب

بلاشک مری فوج ہے بے شمار
مگر پھر بھی اک گونہ ہے انتشار

یہی سوچتا رہتا ہوں دم بدم
بہت ہوتے بھی لاؤ لشکر ہے کم

اِدھر بھشم ہے تو اُدھر بھیم ہے
کہوں سچ کہ اُس سے مجھے بیم ہے

رہیں باخبر جو ہیں اُس کے قریب
کمک وقت پر بھشم کو ہو نصیب

دریودھن کی ہمت بڑھے، اِس لئے
مہا سنکھ پھونکا جری بھشم نے

وہ آواز یا شیر کی تھی ڈکار
جیسے دیر سے ہو تلاشِ شکار

پھر اک ساتھ سب باجے بجنے لگے
کہ طوفانی بادل گرجنے لگے

نفیری کی چنگھاڑ، قرنا کا شور
کڑم دھم وہ تاشوں کی بھوپو کا زور

دماموں کی دھوں دھوں ہڑک کی کھڑک
کہ ہو مات بجلی کی جس سے کڑک
وہ جھانجھوں کی جھنکار، گھنٹوں کا غل
فلک گنگ تھا، مشغل بہر گل
طلسمی تھی رتھ جس میں تھے جلوہ گر
سری کرشن اور ارجن خوش سیر
وہ جب سنکھ اپنے بجانے لگے
قیامت قیامت پہ ڈھانے لگے
لیے کرشن بھی سنکھ اس ڈھنگ کا
جو تھا دیو کے استخواں کا گڑھا
اندر ارجن کا سنکھ اندر کا ہدیہ تھا
شکم گرگ بھیم اتنے میں آ ملا
لئے ہاتھ میں سنکھ اتنا طویل
کہ جیسے ہو خالی کیا پائے پیل
یودھشٹر وہ کنتی کا روشن گہر
لئے سنکھ نام اس کا صوت ظفر
نکل کا تھا وہ سنکھ جس کی صدا
بدل دیتی تھی چیخ میں کُل فضا!

لہ پانڈوؤں کی ماں کا نام ہے۔

مرصع جو سہدیو کا مہرہ تھا
خزانہ تھا رنگیں نغمات کا
سکھنڈی وکاسی دھرشتا دمن
وراٹ اور ساتیک یکتائے فن
دروپد بھی اور اس کے لڑکے بھی تھے
علاوہ سبھدرا[۱] کے فرزند کے
یہ سب پھونکتے سنکھ تھے بار بار
لرزتا تھا جس سے دل کوہسار
سمک[۲] سے سما تک تھا اِک تہلکہ
یہاں سے وہاں تک بھرا زلزلہ
دھرتراشٹر کی فوج کو دیکھ کر
علم تیغیں، چلّے کمانوں میں سر
سنبھل بیٹھا ارجن بصد کرّ و فر
کہ اتنے میں آنے لگے تیر اُدھر
اُٹھائی کمان اور جھنڈا جو تھا
علامت سے بندر کی آراستہ
ہرشی کیش[۳] سے پھر یہ کی التجا
وہاں رتھ کھڑی کیجئے اب شہا

[۱] ارجن کی بیوی۔ [۲] زمین۔ [۳] سری کرشن کا ایک نام۔

جو میدان فوجوں کے ہے درمیاں
نہیں ہے یہاں کی سی گنجلک وہاں
کہ میں اُن کو نزدیک سے دیکھ لوں
مجھے جن سے درپیش ہے کشت خوں
اکٹھا کئے ہیں جو آتش واسطے
دھرتراشٹر کے دُشٹ اس پوت[۱] نے
یہ سنتے ہی "فردوسی رتھ بان" نے
چلائی رتھ اُس سمت اک شان سے
جہاں بھشم اور اُس کے ہم چشم تھے
درونا بھی اور دوسرے منچلے
ہوئے کشن ارجن سے یوں ہمکلام
وہ ہیں سامنے کورو اے نیک نام
نظر آئے ارجن کو اپنے عزیز
بڑے، چھوٹے، اہل ہنر، باتمیز
یہ دادا، یہ نانا، چچا ہے کوئی
بھتیجا ہے، ماموں پھوپھا ہے کوئی
اِدھر کچھ اُدھر کچھ ہیں شامل رفیق
یہ کوروں تو وہ پانڈوؤں کا شفیق

[۱] دریودھن کی طرف اشارہ ہے۔

جب ارجن نے دیکھا مخالف ہوئے
جو پیارے تھے یا پیارے اپنوں کے تھے
عوض اس کے ہو طبع کو اشتعال
ہوا فرطِ اندوہ سے جی نڈھال
وہ گرِدھر سے اِس طرح گویا ہوا
کہ اے ناتھ میں دیکھتا ہوں یہ کیا
جو کل تک تھے اپنے پرائے ہوئے
نہ جانے ہیں کس کے پڑھائے ہوئے
مرے بس میں اب میرے اعضا نہیں
کہیں میں ہوں آنکھیں کہیں دل کہیں
زباں خشک ہے سنسنی تن میں ہے
لرزتا ہے ایک اک رُواں اپنے بدن پہ
تصور میں لاشوں کا اک ڈھیر ہے
جہاں میری نظروں میں اندھیر ہے
کماں چھٹتی ہے رعشہ ہاتوں میں ہے
بہکنے کا انداز باتوں میں ہے
دُھواں دل سے رہ رہ کے اٹھنے لگا
مرا تن بدن آہ پھنکنے لگا

کھڑے رہنا بھی اب تو مشکل ہوا
ہر اک سانس پیغام ہے موت کا
نہیں ہے، نہیں ہے بجز درد و غم
مآل ایسی خونریزی کا اُف ستم
قوی ہاتھ کب ایسے مانے گئے
لہو میں جو اپنوں کے سانے گئے
جہاں فتح میں اس قدر پیچ ہیں
حکومت کہ دولت ہو سب ہیچ ہیں
بھلا خوش دلی ساتھ کیا لائے گی
یہ فتح و ظفر خون رُلوائے گی
نہیں جینے کا یہ قرینہ بھلا
لہو گھونٹ اس سے پینا بھلا
اگر زندگی کی ہے قیمت یہی
بہت مہنگی اِن مولوں ہے زندگی
نہیں اس طرح جنگ کرنا قبول
مجھے لاکھ بار اس سے مرنا قبول
کمانیں جو کڑکیں گی کڑکا کریں
جو برسیں گی تیغیں تو برسا کریں

نہ ہوگا یہ مجھ سے تو اے مدھ سودن
کروں آپ تاراج اپنا چمن
صلہ قتل و غارت کا پایا تو کیا
جو تر لوک بھی ہاتھ آیا تو کیا
حکومت یہ مانا کہ مِل جائے گی
کلیجے کو یاد اس کی برمائے گی
یہ سچ ہے کہ دشمن گنہگار ہیں
جفاکار و مکار و غدار ہیں
اُنہیں ہم نے مارا تو ویسے ہوئے
جو پاپ اُن کے تھے اپنے ذمے لئے
اُسی حرص و غصہ کے ہم ہیں شکار
عدو جس کے باعث ہے نظروں میں خوار
اگر اُن کو لالچ نے اندھا کیا
بنے ہم بھی ویسے تو پھر کیا مزا
جنر دھن "سرورِ دلِ مردماں"
تباہی میں آتے ہیں جب خانداں
تو ہوتے ہیں محروم پاکی سے بھی
حیا، غیرت، اور پاکبازی سے بھی

جو وابستہ تھی گھر سے راحت گئی
اور اس کے گئے ہر مسرّت گئی
جہاں دخل بدکاریوں کا ہوا
کسے ہوش پھر نیک اعمال کا
اُدھر عورتوں سے بھی شرم اُٹھ گئی
ہر اک مارے خواہش کے اندھی ہوئی
جہاں مختلف ذاتیں گڈمڈ ہوئیں
نرک کا کھُلا جادۂ آتشیں
اکیلے انہیں کی نہ تھی یہ ڈگر
خرابی کے بانی بھی تھے ہم سفر
کہ تھی آگ اُن کی لگائی ہوئی
مُصیبت انہیں کی تھی ڈھائی ہوئی
علاوہ بریں پتروں کی روحیں بھی
جو اب تک سُکھی تھیں ہوئیں وہ دُکھی
نہ روٹی ملی اور نہ پانی ملا
کہ باقی کوئی نام لیوا نہ تھا
عزیزوں کے ساکھے کا تھا یہ ثمر
پئے جاہ دنیا، پئے کسب زر

کوئی اس سے بڑھ کر برائی نہیں
بڑا پاپ ہے یہ لڑائی نہیں
کہیں اس سے بہتر وہ حملہ کریں
مرے قتل کا سب تہیہ کریں
مقابل رہوں سینہ تانے ہوئے
نہتا، نہ تیر اور نہ ترکش لئے
برابر چلیں نیزہ و گرز و تیر
فقط ہو خموشی مری دستگیر
نہ کیجئے دیال آپ ایسا گماں
کہ "گنڈیو"[1] برسائے گی بجلیاں
گرا رتھ میں ارجن یہ کہتا ہوا
ہزاروں الم دل پہ سہتا ہوا

---

[1] ارجن کی کمان کا نام ہے۔

دوسرا ادھیائے

سانکھیہ یوگ

کشن نے جب ارجن کا دیکھا یہ حال
جو ہمدردی و رحم کا تھا مآل
بجھے تیور، آنکھوں میں آنسو بھرے
جھکا سر، ہتھیلی پہ ٹھڈی دھرے
تو مدھوسودن اس سے یہ کہنے لگے
وہ لہجہ تھا، فولاد بہنے لگے
یہ کمزوری اور اس قدر بزدلی
جری کے لئے بات ہے شرم کی
کہیں راہ نیکی نہ مسدود ہو
زمانے سے یہ جنس مفقود ہو
سپاہی کی شہرت کو دھکا لگے
چھڑائے نہ چھوٹے وہ دھبا لگے

بہا دی گئی تیری غیرت کدھر
اُٹھا اور اپنے سے تھڑدلی دور کر
نہیں یاد کیا اے جلالت مآب
ترا نام بہر عدو تھا عذاب
یہ ارجن نے ایک آہ بھر کر کہا
کروں کیا کہ اٹھتا نہیں دل مرا
چلے بھشم پر ناوک بے خطا
کہ سر پر درونا کے کھیلے قضا
یہ دونوں شریف اور نکوکار ہیں
بڑے آن والے ہیں خوددار ہیں
کہیں ہے یہ بہتر گدائی کروں
کہ اِن کا لہو پی کے شاہی کروں
محبّت ہے جن سے سلامت رہیں
پرستار اُن کے جئیں یا مریں
خبر کیا وہاں ہار اچھّی کہ جیت
جہاں شرط ہو میت کو مارے میت
برابر ہے کیا موت کیا زندگی
بھیانک ہے اک خواب یا زندگی

اُدھر تو مجھے آ رہا ہے ترس
اُدھر وسوسوں کی یورش ہے کہ بس
خیالات میں ہے عجب خلفشار
مدد کا ہے یہ وقت اے شہریار
گرو آپ ہیں اور چیلا ہوں میں
بس ان شرتوں میں اب تو آیا ہوں میں
کروں کچھ کہ خاموش دیکھا کروں
مجھے آگیاں دیجیے کیا کروں
جو روئے زمیں بھی ہو زیرِ نگیں
مجھے چین آنے کا دم بھر نہیں
جو دیوتاؤں کی خاص قدرت ملے
وہی دبدبہ اور عظمت ملے!
نہ ہو پھر بھی جز درد پہلو نشیں
جو آرامِ جاں ہیں وہی جب نہیں
مرے جسم کو غم گھلاتا رہے
مری رُوح کو داغ کھاتا رہے
کروں کیا کہ دل پر اجارہ نہیں
مجھے اُن سے لڑنا گوارا نہیں

"دلوں کے شہنشاہ" سے یہ کہا
بھری آہ ارجن نے اور چپ ہوا
جب ارجن پہ تھی یاس چھائی ہوئی
غیور آنکھیں تھیں ڈبڈبائی ہوئی
کرشن لطف سے مسکرانے لگے
اور انمول موتی لٹانے لگے
یہ موقع نہیں رنج کا نیک خو
تری گفتگو ہے عجب گفتگو
بظاہر تو باتیں ہیں داناؤں کی
نہ یہ آگہی ہے نہ دانشوری
جو دانا ہیں زندوں کو روتے نہیں
مردوں کے لیئے جان کھوتے نہیں
نہیں اور نہ تو اور نہ اِن میں کوئی
نہ معدوم تھا اور نہ ہوگا کبھی
نہ کچھ ابتدا ہے نہ کچھ انتہا
مگر پھر بھی ہے ایک تانتا لگا
جو ہے ہست، جینا اُسے ناگزیر
نہیں کوئی تخصیص برنا و پیر

لڑکپن جوانی بڑھاپے کی طرح
اک آنے کی ہے ایک جانے کی طرح
بدلتی ہے مسکن فقط زندگی
بلندی کبھی ہے تو پستی کبھی
سمجھتے ہیں یہ نکتہ عاقل جو ہیں
نہیں اُن سے مطلب کہ جاہل جو ہیں
مگر وہ حواسوں کی ہے زندگی
عناصر کی ہے جس میں غارت گری
جو محسوس کرتی ہے گرم اور سرد
خوشی اور غم کی ہے جس میں نبرد
وہ ہے کم ثبات اور تغیر پذیر
نہیں ہوتے ذی فہم اُس کے اسیر
انہیں کی طرح تو بھی برداشت کر
انہیں کی طرح اس کی پرداخت کر

حواسوں کا پہرا نہیں روح پر
خوشی کی حکومت نہ غم کا اثر
توانا ہے اور مطمئن متصل
دوام اس کی جولاں گہ مستقل

اُدھر تو جو ہوتی ہے ہو اُدھر ہو
نہیں ربط اُدھر نیست سے ہست کو
نہ سمجھے وہ حقیقت یہ جن پر کھلی
یہاں کیا ہے پائندہ کیا رفتنی
فنا آتما ہو یہ ممکن نہیں
مکاں جسم ہے آتما ہے مکیں
یہی جلوہ گر ہے یہی جلوہ زا
جلاتے ہیں جیسے دیئے سے دیا
یہ کم ہو کہ ٹھہرے کہ بدلے محال
کوئی اس کے قبضے سے نکلے محال
فنا جن پہ حاوی ہے اجسام ہیں
جو اس کا تاسف کریں خام ہیں
غلط ہے سراسر غلط انتشار
کمر باندھ ارجن پے کارزار
نہ قاتل کوئی ہے نہ مقتول ہے
امر آتما نا سمجھ بھول ہے
کبھی آتما مر سکتی نہیں
یہ خود موت سے ہار سکتی نہیں

یہ دائم ہے پیدا ہوئی ہی نہیں
جو پیدا نہ ہو وہ فنا بھی نہیں
نہ تھا کوئی لمحہ کہ جب یہ نہ ہو
اچنبھا ہے اول کہ آخر کہو
ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے
فقط جسم مرتا ہے مرتا رہے
جو سمجھا کہ یہ ختم ہوتی نہیں
کبھی اونگھتی اور سوتی نہیں
خود اُس میں ہے خوراک اُس کی نہاں
جہاں میں ہے لافانیت کا نشاں
نہ کاٹے کٹے اور نہ مارے مرے
تو پھر قتل کا کون دعوےٰ کرے
جسے موت سے کچھ علاقہ نہیں
اُسے مارنا کھیل ٹھٹھا نہیں
بدلتے ہیں جس طرح رختِ کہن
یہی روح کا جسم سے ہے چلن
لباس آج یہ اور کل دوسرا
بدلتا رہے گا بدلتا رہا

کوئی ضرب اس پر نہ ہو کارگر
نہ آگ اور پانی سے پہنچے ضرر
ہوا سے یہ پژ مردہ ہوتی نہیں
کرو کچھ جتن مردہ ہوتی نہیں
نئی موت ہو یا نئی زندگی
وہی روح ہے اور وہی روح تھی
ولادت کا ٹھہرا نتیجہ وفات
یونہیں موت میں جلوہ گر ہے حیات
مقدر ہے جو کچھ نہ ہونا غلط
وہ ہو کر رہے گا تو رونا غلط
یہ صورت اور اندوہ کا جوش ہے!
قوی پنجہ سردار، کچھ ہوش ہے؟
تبر تیر نیزہ نہ تلوار ہے
بہانہ تغیر کو درکار ہے
یہ سچ ہے کہ ہمت شکن ہے یہ راز
گڈھب راہ، منزل بھی دور و دراز
کہیں شبہ اہلِ اعتمادی کہیں
زباں رکنے لگتی ہے آکر یہیں

کسی نے اگر کھول کر بھی کہا
معما جو تھا وہ معما رہا
مگر دیکھئے کہنے سننے کے بعد
بہت سوچنے اور سمجھنے کے بعد
کھلا زندگی ہے بشر میں نہاں
فنا ناپذیر اس کی پہنائیاں
پہنچ ہی نہیں سکتا اس کو گزند
ترا وہم باطل ہے اے ہوشمند
ادا کر جو اس دم ترا فرض ہے
ترے ذمے اے چھتری قرض ہے
ترے نام پر حرف آئے نہیں
ہنسی اُس کی دُنیا اڑائے نہیں
پئے حق جدل ہو تو اس کے سوا
سپاہی کو درکار ہے اور کیا
یہ بیکار عشرت کا پیغام ہے
کہ نام آوری اس کا انجام ہے
نہ ڈھونڈا گیا اور پتا مل گیا
نہ چاہا گیا اور صلہ مل گیا

جو اس معرکے سے کیا انحراف
تو کہتا ہوں اس وقت میں صاف صاف
کہ ہوتے ہوئے فرض سے آگہی
اگر اس سے پہلو تہی کی گئی
تو ایسے گنہ کا ہوا ارتکاب
عقوبت کا جس کی نہیں کچھ حساب
ترا نام ننگ زمانہ رہا
زمانے میں اس کا فسانہ رہا
شریف اور بہادر اگر یوں ہو خوار
تو یہ موت سے بڑھ کے ہے ناگوار
یہ سرہنگ جو ہیں مقابل کھڑے
کہیں گے کہ ڈر کر بچا جنگ سے
جو رتبے سے واقف ہیں وہ اے جری
نظر تجھ پہ ڈالیں گے تحقیر کی
نکالیں گے وہ شاخسانے عدو
کہ رسوائی ہو جائے گی کو بکو
یہ اچھا ہے یا مر کے پانا سورگ
دگر نہ ظفر ناشناسائے مرگ

اٹھا ترکش اے کُنتی کے لاڈلے
جو بُجھ بل سے لیتے ہیں وہ کام لے
خوشی اور غم کو برابر سمجھ
یہاں بیش و کم کو برابر سمجھ
کسے فتح کہتے ہیں اور کیا شکست
ہوئے جب کہ ہموار بالا و پست
پئے جنگ فوراً کمربستہ ہو
نہ اندوہگیں ہو نہ دل خستہ ہو

مطابق تھا وہ سانکھ کے جو کہا
توجہ سے تو جس کو سنتا رہا
سُن اب یوگ کی گہری تعلیم سُن
کہ اُکھڑے کرم بندھ کی بیخ و بن
وہ ڈوریں جو بندھن ہیں اعمال کے
جو اُلجھن ہیں ماضی کے اور حال کے
نہ پھر ایک لینا نہ دینا ہے دو
جو انسان سے کام بے لوث ہو
کوئی سعی بیکار جاتی نہیں
جو بیکار جائے، رُلاتی نہیں

ڈرے اور نہ ڈھونڈے کسی کی پناہ
دل مطمئن ہے خود اپنی پناہ
زیاں کاریاں اور نہ لپپائیاں
ضرورت ہے لیکن یقیں کی یہاں
تہ دل سے اُس پر جو ہو اعتقاد
تو ڈھا جائے خوف و خطر کی نہاد
ارادے سے اپنے جو ٹلتا نہیں
غلط راستے پر وہ چلتا نہیں
عقیدہ اگر خام ہے، کچھ نہیں
فقط نام ہی نام ہے، کچھ نہیں
جو ویدوں کے مطلب سے واقف نہیں
فقط ظاہری حرف ہیں دل نشیں
وہ ناداں کہتے ہیں سب کچھ ہے وید
نہیں اس سے باہر کوئی اور بھید
شب و روز خواہش میں ہیں مبتلا
سورگ ہاتھ آئے یہ ہے مُدعا
ملے بگ کہ خیرات سے کام دل
مگر مِل چکا اس سے آرام دل

عمل جب نہیں ہے تو پھر کچھ نہیں
عمل سب نہیں ہے تو پھر کچھ نہیں
ہوس کا ہے دنیا میں سارا فساد
نہ ہو یہ تو انسان جیے شاد شاد
کبھی نفس امارہ کا زور ہے
ملامت گری کا کبھی شور ہے
جسے دیکھیے شانتی کی تلاش
مگر ساتھ ہی ساتھ فکرِ معاش!
جو کہتے ہیں ہستی عمل کا ہے پھل
سمجھ لے دماغوں میں ان کے خلل
یہ باتیں گڑھی ہیں فقط اس لیے
کہ دولت خوشی اور حکومت ملے
نہیں درخورِ اعتنا اُن کی بات
کہ لفاظی ٹھہری ہے کل کائنات
نہیں رکھتے وہ طبعِ روشن سمجھ
نہ رہبر سمجھ، اُن کو رہزن سمجھ
گئے ہیں بیاں ویدوں نے تین گُن
انہیں تک ہے محدود اُن کا سخن

جہاں تک وہ تعلیم ہے خوب ہے
مگر آگے بڑھنے کا اسلوب ہے
گنوں کے تعین سے آزاد ہو
گوارا نہ کر ان کی بھی قید کو
اسی طرح اضداد کو ترک کر
بھٹکتی ہے ان میں اُلجھ کر نظر
"دوامی صداقت" ہو مسکن ترا
چمکتا رہے من کا درپن ترا
نہ کچھ نفع و دولت کی حسرت رہے
خود اپنی خودی پر حکومت رہے
برہمن کہ رسموں کا پابند ہے
نگاہِ حقیقت نگر بند ہے
وہ مورکھ جو واقف نہ ہو بھید سے
اٹھائے بھلا فیض کیا وید سے
سمندر جہاں ٹھاٹھ لیتا رہے
وہاں تال کا کیوں نظارا رہے
برہمن جو در اصل ودوان ہے
یہیں اُس کو ویدوں کی پہچان ہے

تجھے یوگ سب سے کرے گا جُدا
نہ رہ جائے گا کچھ برہم کے سوا
جو اس پر عمل ہو تو اے نیک ذات
مِلے تجھ کو آواگون سے نجات
فقط کام کے واسطے کام ہو
ہر اک کام خود اپنا انجام ہو
کئے کا نہ کچھ اپنے حاصل سمجھ
صلے کی تمنا کو باطل سمجھ
اگر یوں نہ ہو زشت انجام ہے
کہ خود کار نیک اپنا انعام ہے
رہے نفس پر ہر گھڑی اختیار
علائق سے ہونے نہ دے پُر غبار
نہ کچھ کامیابی کی پروا رہے
غم نامرادی نہ اصلا رہے
یہ انداز دل کا سراسر رہے
کہ دونوں کا پلہ برابر رہے
جب اتنا تجھے ضبط حاصل ہوا
سمجھ لے دلِ مطمئن مل گیا

عمل ہی ترے ہوں عبادت تری
یوہیں بارور ہوگی محنت تری

نہ کر اُن کی عزت جو ہیں نیک رو
پلے اجر، اور اجر بھی تو بنو

یہ خالص عبادت کا دستور ہے
کہ ہر قسم کے لوٹ سے دُور ہے

کسی سے علاقہ نہ بیگانگی
کہ ہے اور کچھ منزلِ آگہی

نہیں گیان کا تُو اے خوش خصال
میسّر نہیں ہوتا گُن کا کمال

وہی یوگ ہے اور وہی شانتی
الگ یوگ سے یہ نہیں شے کوئی

یہ کی عرض ارجن نے اب ہو بیان
جو ایسے خودآگاہ کا ہے نشاں

جو ہو رنگ حرکات و سکنات کا
طریقہ نشست اور برخاست کا

وہ کرتا ہے کس قسم کی گفتگو
باندازِ دلکش ، بطرز نکو

کہا، ترک جب خواہشوں کو کیا
کہ ہنگامہ جن سے تھا دل میں بپا
خود اپنے میں اس وقت راحت ملی
جو ہے لازوال ایسی دولت ملی
ہوئی شانتی آتما کو نصیب
ہوئی اپنے آزار کی خود طبیب
ثبات اُس کی دانش کو حاصل ہوا
وہ دراصل انسان کامل ہوا
جہاں عقل کو استواری ہوئی
ہر اک روگ سے رستگاری ہوئی
غم و رنج سے پھر علاقہ نہ تھا
وہ پھر نفس کا اپنے بندہ نہ تھا
اُسے دغدغے پھر ستاتے نہیں
کبھی وسوسے پاس آتے نہیں
حواسوں پر اس کو ہے وہ دسترس
جو کچھوے کو اعضا پر اپنے ہے بس
سب اندر سمیٹے جو کھٹکا ہوا
ذرا بھی جو دھڑ کا خطر کا ہوا

ہوئیں دُور جب خواہشیں نفس سے
وہیں محو تھیں کاہشیں نفس سے
جو رہ بھی گیا کوئی دھندلا نشاں
مٹا، جلوۂ ذات دیکھا جہاں
غلط کاریاں ہیں نہ نفسانیت
وہ انسان ہے فخر انسانیت
رشی بھی وہی ہے، وہی ہے منی
سزا وار کہلانے کا "آدمی"
یہ ممکن ہے ایسا بھی ہو اتفاق
کہ گزرے اہنسا طبیعت پہ شاق
وہ ہیجان ہو طبع خود دار میں
کہ قائم نہ اس کی حدیں رہ سکیں
اُسے ایسی حالت میں یہ چاہیئے
خیالات میری طرف پھیر دے
یہ لازم ہے قابو رہے نفس پر
ریاضت سے حاصل کرے یہ ہنر
وگرنہ حواسوں کی صورت کشی
کشمش اپنی دکھلائے گی لابُدی

کشمش اور خواہش نہیں دور دور
جہاں وہ ہے اس کا بھی ہونا ضرور
جہاں خواہشوں نے مچایا اودھم
کھینچی نفس سرکش کی تیغ دو دم
ملے خاک میں سب عزائم بلند
بھلائی سے نفرت، برائی پسند
حواسوں کی دعمال رو کی اگر
نہ للچائی نظروں سے دیکھا اُدھر
عداوت کہ الفت سے بالا رہا
انہیں "روح عادل" کا تابع کیا
خلش سے رہی طبع آزاد پاک
سکوں آشنا، خودنگر، تابناک
ہوئی یکسوئی یاد غم کی مٹی
بدی کی طرف سے طبیعت ہٹی
مگر نفس کا اپنے بندہ جو ہے
وہ جاہل ہے اس کو نہیں علم سے
دل مطمئن سے وہ محروم ہے
غلط کوش و محزون و مغموم ہے

حواسوں سے مغلوب ہونا یہاں
سفینے کا لنگر ہے کھونا یہاں
گھری ناؤ جھونکوں میں طوفان کے
ہوئی غرق، لالے پڑے جان کے
شب تار سے بڑھ گئے تاریکیاں
نظر آتی ہیں نا سمجھ کو جہاں
وہ دانا کی آنکھوں میں تابندہ ہیں
نوازندہ و نور بخشندہ ہیں
اسی طرح ظلمت وہ دیکھا کیا
بظاہر جہاں نور ہی نور تھا
سمندر کی ہیں اُس کی گہرائیاں
جیسے سینچتی رہتی ہیں ندیاں
مگر اس کو چھلکائیں ممکن نہیں
بدستور ہے استقامت گزیں
یہی حال اُس مردِ کامل کا ہے
جو خود بحر بھی اپنے ساحل کا ہے
حواسوں کی دنیا سے دریا ہزار
گریں آکے، پر عزم ہے استوار

تغیر اُسے چھو بھی جاتا نہیں
عمق نفس کا اس کے پاتا نہیں
وہ ہر چند لیتا ہے اُن سے خراج
وقار اُس کا قائم ہے، قائم مزاج
جو اگوشت اور پوست کا جب ہٹا
جو خواہش کا بندہ تھا، آقا ہوا
سبک طبع ہے اور نہ مغرور ہے
اماں پا گیا، اس سے مسرور ہے
"برہم" سے ہے موسوم یہ کیفیت
ملے، نفس کی ہو اگر تربیت
نہ بیم و رجا کا وہاں شائبہ
نہ کچھ لابھ اور لوبھ کا دغدغہ
یہاں بھی برہم اور وہاں بھی برہم
یہاں سے وہاں تک برہم ہی برہم
وہ دیوتاؤں میں جا کے شامل ہوا
کہ نروان کا درجہ حاصل ہوا

تیسرا ادھیائے

کرم یوگ

جنر دھن یہ جب گیان کی شان ہے
کہ گن سامنے اس کے بے جان ہے
تو پھر جنگ پر مجھ سے اصرار کیوں
پے قتل کرتے ہیں طیار کیوں
کھلا کچھ نہ تقریر کا مدعا
مرے دل میں پھر شبہ پیدا ہوا
وہی میں ہوں اور پھر وہی اضطراب
دوبارہ ہوئی دل کی حالت خراب
بتا دیجئے اب وہ رستا مجھے
کہ جس میں بھلائی ہے میرے لئے
ہوئے کیشو اس طرح گرم سخن
کہ "اے نازش صد بہار چمن"

پئے اہلِ دنیا ہیں دو راستے
خرد مند کے ہیں یہی مدرسے
ہے اک سانکھ اور یوگ ہے دوسرا
یہ ہے گیان، وہ کرم کا راستا
یہ دونوں ہیں لیکن حقیقت میں ایک
کہ ہے کام اچھا جو نیت ہے نیک
نہ ہو فعل سرزد، مگر قصد تھا
تو گویا وقوعِ عمل ہو گیا
نہ کرنا بچاتا نہیں کرم سے
کہ ہے ربط اس کو دل گرم سے
فقط ترک سے کب وہ کامل ہوا
جو سعیِ عمل پر نہ مائل ہوا
کبھی راہِ مقصود پاتا نہیں
کمال اس طرح ہاتھ آتا نہیں
معطل نہیں ایک پل بھی کوئی
خلاف اس کے فطرت ہے انسان کی
تصور عمل ہے، تخیل عمل
تعطل کا پھر کون سا ہے محل

بظاہر معطل جو انسان ہے
تو جولاں خیال اُس کا اُس آن ہے
تقاضائے تن کو دبایا تو کیا
طبیعت کا میلان اُدھر ہی رہا
نہ سمجھا یہاں کے فراز و نشیب
شکار اپنا آخر ہوا خود فریب
مگر جس کا تن ہے قوی من قوی
جو خدمت کیا کرتا ہے روح کی
جو خواہش سے مغلوب ہوتا نہیں
بُری باتوں میں وقت کھوتا نہیں
خیالات نیک اور اطوار نیک
شریف اس کا نفس اور کردار نیک
وہ مدنظر نفع رکھتا نہیں
نتیجے کو اس سے پرکھتا نہیں
وہ کر کام ارجن جو سونپا گیا
کہ ہے کار بیکاریوں سے بھلا
ترقی کی راہیں نہ مسدود کر
رہے عظمت روح مدنظر

جو اپنے لئے ہو وہ جینا نہیں
یہ جینے کا اچھا قرینا نہیں
فراست یہی ہے، یہی زیرکی
الگ رہیئے خود اپنے کاموں سے بھی
جو نافہم ہے ان میں اُلجھا رہا
انہیں کو وہ سب کچھ سمجھتا رہا
خودی کا ہے بندہ، خودی میں ہے خوش
فقط جھوٹی آسودگی میں ہے خوش
وہی کام لازم ہے کُنتی کے لال
نہ ہو شادی و غم کا جس میں سوال
سُنا کیا نہیں قول پرجا پتی
ہوئی جب کہ تخلیق سنسار کی
کرو کام بھی اور قربانیاں
اگر چاہتے ہو فراوانیاں
کہ جب یگ ہوا مدعا کام کا
رہا پھر نہ محتاج انعام کا
یہی کامدھین ہے "فراغت کی گائے"
جو سیوا کرے اُس کی دودھوں نہائے

یہی دیوتاؤں کی توقیر ہے
اور اس طرح کے یگ کی تاثیر ہے
اگر یوں تو اُن سے ہوا بہرہ مند
نہ ہوگا فراغت کا در تجھ پہ بند
بچی رہ گئی یگ سے پھر جو غذا
گناہوں سے پاکی ہے اُس کا صلا
مگر جو نہ اس طرح پائی گئی
نہ پائی سمجھ وہ چرائی گئی
غذا کا ہے محتاج ہر ذی حیات
نہ ہو مینہ تو رہ جائے رکھی حیات
وہ یگ ہے کہ بارش کا ضامن جو ہو
وہ ہے کام یگ کا معاون جو ہو
نہ مشکل اور آرام کی چاہیئے
بنا یگ پہ ہر کام کی چاہیئے
ادھر وید میں یگ کا ہے تذکرہ
اُدھر چشمہ ذات احد وید کا
ہر اک شے میں جب دخل ہے وید کا
تو حاصل ہر اک کام کا یگ ہوا

جو یوں ہو تو ہے زندگی کامیاب
وگرنہ ہے ہر لحظہ صرف عذاب
جنک کو اور اُس کے جو امثال تھے
ملیں برکتیں نیک اعمال سے
طریق اُن کا جو تھا وہ کر اختیار
بنا حق پرستی کو اپنا شعار
جدھر دیکھا جھکتے ہیں خاصان رب
اُدھر ٹوٹ پڑتی ہے مخلوق سب
مجھے دیکھ پر تھی کے نورِ نظر
کہ اب تک کمر باندھے ہوں کام پر
نہیں گو کہ تر لوک ہیں کوئی کام
کہ جس کا نہ میں نے کیا انصرام
مگر پھر بھی رہتا ہوں سرگرم کار
ہدایت ہے لوگوں کی میرا شعار
مبادا وہ پھر ایسے گمراہ ہوں
کہ منزل سے اپنی نہ آگاہ ہوں
جو میں کام سے اپنے غافل رہا
نہ دُکھ درد میں ان کے شامل رہا

قدم اُن کے اس طرح ڈگ جائینگے
بمشکل رہ راست پر آئیں گے
حواسوں کے ماتحت محنت بھی ہے
اسی طرح بے لوث خدمت بھی ہے
جو ہتکاری ایسا ہے آزاد ہے
کٹھن کام جیسا ہو دل شاد ہے
نظر میں زمانے کی بہبود ہے
نجات اہلِ عالم کی مقصود ہے
تہ تج بیٹھیں دولت یقیں کی کہیں ہے
دل سادہ میں پاس ہو جاگزیں
جو ہے فرض جس کا وہ پورا کرے
مساوات برتے مدارا کرے
کسی سے غرض ہو نہ مطلب یہاں
رہے روح بالائے سود و زیاں
یہ فطرت کا آئیں ہے اے خوش گہر
کہ ہیں جملہ اغراض شیر و شکر
نہیں ہے جو نادان دانائے راز
سمجھتا ہے اپنے تئیں کارساز

یہ میں نے کیا اور وہ میں نے کیا
درانحالیکہ دخل مطلق نہ تھا
مگر جو ہے رمز آشنائے خودی
سمجھتا ہے وہ لم ہر اک بات کی
جو منشائے فطرت ہے معلوم ہے
کدھر سب کی رجعت ہے معلوم ہے

جو ہو کام وہ ہو مرے نام پر
رہے اپنے باطن کی جانب نظر
نہ رکھ دھیان ہیں نفع و بہبود کو
یہ کہہ کر جو ہونا ہے انجام ہو
اس انداز سے بے دھڑک جنگ کر
شکوک اور اوہام سے در گزر
سُنا کیا نہیں قول مشہور ہے
کہ انسانِ فطرت سے مجبور ہے
عمل خواہ روشن کہ تاریک ہے
وہی ہے جو فطرت کی تحریک ہے
تو بے سود ہے فکر ترک عمل!
عمل میں نہیں پڑنے کا جب خلل

حواسوں سے ہے جس عمل کا لگاؤ
محبّت کہ نفرت سے ہوگا لگاؤ
کبھی ان کے پھندے میں آنا نہیں
تری راہ کر دیں نہ کھوٹی کہیں
نہ کوتاہی اس میں ذرا کیجئے
خود اپنا ہی فرض آپ ادا کیجئے
اگر روگ اوروں کا پالا نہیں
تو مرنے میں بھی کچھ کسالا نہیں

تب ارجن نے پوچھا مرے رہنما!
بشر کیوں ہے سوئے بدی دوڑتا
خلاف اپنی مرضی کے کھنچتا ہوا
زبردستی جیسے ڈھکیلا گیا
یہ مانا بدی اس کی طینت نہیں
رہے باز اتنی بھی قدرت نہیں

ہوئے یوں گہر ریز بھگوان تب
سن ارجن بتاتا ہوں اس کا سبب
یہ ہے "کامنا" نفس کی خواہشیں[1]
اسی کا ہیں جنجال سب کاہشیں

[1] خواہش

یہ سب آفریدہ ہیں ظلمات کی
عمارت کھڑی ہے طلسمات کی
بڑی پرفتن ہے گنہگار ہے
گرفتار شہوت ہے غدار ہے
زبردست دشمن ہے انسان کی
کوئی حد نہیں اس کے طغیان کی
دھواں ہے کہ جو آگ پر چھا گیا
وہ ہے زنگ لوہے کو جو کھا گیا
رحم میں جو نطفے کا ہوتا ہے حال
جسے جکڑے رہتا ہے جھلّی کا جال
یونہی آدمی نفس کا ہے غلام
یہ ہے اور آلودگی صبح و شام
پھسل کر نہیں گرتے عاقل بھی ہیں
کہ عاقل کبھی وقت غافل بھی ہیں
عدو ہے یہ ہوش و خرد کی سدا
ذرا چوکے اور وار اس کا چلا
نہ جانے بدلتی ہے یہ کتنے روپ
کوئی روپ انوکھا تو کوئی سروپ

نہیں اس سے محفوظ پانچوں حواس
فریبوں پہ قائم ہے اس کی اساس
کبھی ہوتی ہے وجہ دیوانگی
دکھاتی ہے راہ ضلالت کبھی
جھکاتی ہے ایسے کوئیں اور کٹھور
کہ ہو جاتے ہیں آنکھوں والے بھی کور
جو دانا ہے چھینٹوں میں آتا نہیں
وہ اس سے کبھی دل لگاتا نہیں
بچا اپنی ہستی کو تخریب سے
خبردار رہ جھوٹی ترغیب سے
نہ ہو علم سے جہل تجکو عزیز
کہ منھ موڑ لیں عقل و ہوش و تمیز
یہ مانا کہ مایا[1] قوی ہے بہت
پلٹ دیتی ہے دم میں آدم کی مت
قوی تر ہے، بخشا جسے امتیاز
اور اس سے بھی برتر دل بے نیاز
اور ان سب کی حاکم وہ روح عظیم
قدم جس سے آباد، حادث دو نیم

[1] تغیر پذیر کائنات کا بنیادی سبب - قدرت

اُسے یاد رکھ تو اُسی سے لگا
خود اپنے میں اُن قوتوں کو جگا
اُٹھ اور جنگ کا فوراً اسلوب کر
شکوک اور اعدا کو مغلوب کر
سمجھ لے کہ قابو سے جاتے رہے
اگر آس جھوٹی بندھاتے رہے

چوتھا ادھیائے

گیان یوگ

یہ بے مرگ کا یوگ کامل وصال
نہیں جس کی تابندگی کو زوال
سکھایا وِشواں[1] کو میں نے ہی تو
ضیا بخشتا ہے جو ظلمات کو
پھر اُس نے منو[2] کو ودیعت کیا
اکشواک[3] کو پھر منو نے دیا
برابر یہ ہوتا رہا منتقل
رہا شاہی رشیوں میں اُتم سجل
مگر وقت جتنا گزرتا گیا
ورق اس کا ایک اک بکھرتا گیا
جو باقی تھی دھندلی سی کچھ روشنی
وہ مانند شمع سحر گل ہوئی

[1] سورج۔ [2] مشہور واضع قوانین۔ [3] قدیم زمانے کے ایک راجا۔

کیا تجھ پہ مدت کے بعد آشکار
اساطیں[1] کا افسانۂ زرنگار
نہیں نغز و شیریں کوئی ایسا راز
کہ خود نغمہ ہے اور نغمہ نواز
یہ واقف ہوں تو ہے پجاری مرا
سراپا ستائش، مجسم وفا
یہ ارجن نے گردھر سے جس دم سُنا
تو حیرت سے منہ دیکھتا رہ گیا
ادب سے یہ پھر لب پہ لایا سخن
کہ اے زینت افروز ہر انجمن
نہ تھی وقت کی بھی جہاں میں نمود
وِوسواں تھا جب رہ نوردِ وجود
تو کس طرح آپ اُس کے پیشیں ہوئے
اور اسرارِ عالم کے سونپے اُسے
نہیں آتی میری سمجھ میں یہ بات
وہ تھا آپ کا موردِ التفات
نہ جانے جنم میں نے کتنے لئے
اور ارجن اسی طرح تو نے لئے

[1] بزرگانِ سلف ؎

مجھے یاد تجھکو فراموش ہیں
یہاں ہوش والے بھی مدہوش ہیں
یہ ہے فرق میں آفریدہ نہیں
گلستاں کی شاخ بریدہ نہیں
اَمٹ اور قابو میں کل کائنات
زمان و مکان و حیات و ممات
مگر اس کے باوصف آتا ہوں میں
پیالے یہاں آکے جاتا ہوں میں
وسیلہ بناتا ہوں مایا کو میں
کرشمے دکھاتا ہوں دُنیا کو میں
مناظر ہر اک سمت آراستہ
بظاہر نہایت ہی پیراستہ
ہوا میں ہوں جس طرح بادل رواں
دھندلکے میں دھندلی سی پرچھائیاں
خیالوں کی خود ساختہ مورتیں
بدلتی ہوئی ہر گھڑی صورتیں
جہاں قدر نیکی کی گھٹنے لگی!
گراں جنس مٹی میں اٹنے لگی

بدی پھیل جاتی ہے جب دور دور
تو اس وقت ہوتا ہے میرا ظہور
جو ہیں نیک اُن کی مدد کام ہے
بدوں کو تباہی کا پیغام ہے
کہ نیکی کا ہو پھر جہاں میں رواج
رہِ راست پر آئے بگڑا سماج
جو سمجھا مجھے چشمہ تخلیق کا
جو پیرو ہوا صدق دل سے مرا
وہ پیدائشِ نو ہو سے چھُوٹا
نہ پھر گوشت کے بوجھ سے دم گھُٹا
رہا دہشت اور خوف سے ہو گیا
رہا کوئی اس کا نہ میرے سوا
کیا شعلۂ علم نے پاک اُسے
ہوا رازِ ہستی کا ادراک اُسے
نہ میرا رہا اور نہ تیرا رہا
فقط "ودیا" کا اُجالا رہا
مجھے جو بھی کرتا ہے جس طرح یاد
وہ پاتا ہے منہ مانگی اپنی مراد

طریقے جُدا ہیں جُدا ہیں چلن
مری راہ میں ہونے کے گامزن

یہاں یگ جو کرتے ہیں اس آس پر
کہ اپنے کئے کا وہ پائیں ثمر

پرستار ہیں نیچے دیوتاؤں کے
وہ انجام اس کا یہیں پائیں گے

مرے آفریدہ ہیں چاروں ورن
کئے اُن میں تقسیم کام اور فن

جو تھا مستحق جس کا وہ پا گیا
کہ انصاف کا تھا یہی مقتضا

میں ہی آفرینش کا بانی ہوا
فنا و بقا کی نشانی ہوا

فنا میرے جوہر کو اصلا نہیں
کہ خواہش سے مجکو علاقہ نہیں

ہر اک کام خود اپنا انجام ہے
جو یوں ہو وہی اصل میں کام ہے

مرے راستے پر یہاں جو چلا
رہا پھر نہ بندھوا وہ اعمال کا

ہوا جس میں پیدا یہ رنگ ثبات
ملی اس کو آواگوں سے نجات
عمل کے ہو میدان میں گامزن
یہی تھا بزرگوں کا تیرے چلن
تجھے آرزو ہے کہ معلوم ہو
جو فعل اور تعطل کا مفہوم ہو؟
یہ تعلیم ایسی نمائش کی ہے
کہ گم عقل ارباب دانش کی ہے
انوکھی ہے تعلیم، اعجوبہ راز
الگ ہے زمانے سے اس کا طراز
جہاں دل نشیں ہو گئے یہ نکات
چلے گی نہ پھر تجھ پہ جنموں کی گھات
جو کہتا ہوں اب، سُن اُسے دھیان سے
عمل ہوتے ہیں تین اقسام کے
روا، ناروا، نفی ان دونوں کی!
کٹھن راہ، آساں نہیں آگہی
سکوں کام میں، کام میں ہے سکوں
حقیقت بس اتنی ہے باقی فسوں

جو یوں کام کرنے پہ مائل ہوا
وہی اس طریقے میں کامل ہوا
سمجھ لے کہ سچ کا ہوا انکشاف
جب اضداد کا مٹ گیا اختلاف
ہوا کام کی طرح آرام خوب
مآل اس کا اور اُس کا انجام خوب
خلش آرزو کی وہ رکھتا نہیں
یہ خار اُس کے دل میں کھٹکتا نہیں
غرض کوئی شامل نہیں کام میں
جو ڈالے خلل اُس کے آرام میں
کہ گیان آگ ہے خواہشوں کے لئے
ہوئیں بھسم جب اس کے لُو کے لگے
جو ایسا ہے داناہے داناؤں میں
وہ آتا نہیں حرص کے داؤں میں
کسی پہ بھروسا وہ کرتا نہیں
قناعت سے دل اُس کا بھرتا نہیں
عمل سے توقع ثمر کی نہیں
لہٰذا کبھی مضطرب ہی نہیں

عمل بہرِ تسکیں ہے کافی اُسے
نہیں کوئی فکرِ تلافی اُسے
عمل میں بظاہر وہ مشغول ہے
مگر پھر بھی عامل نہ معمول ہے
خیالوں پہ جب اپنے قابو رہا
عمل جسم کا مشغلہ ہے تو کیا
عمل اُس سے ہوتا نہیں وہ کہ جو
ملوث کرے روحِ آزاد کو
رہا جب ہوا بیم و اُمید سے
ہوا نفس مفتوح تہدید سے
اثر جب ہوا خارجی ناقبول
برتنے لگا تب یہ زریں اصول
"پلے تن نہیں ماسوا تن کے کچھ
بگڑنے سے کچھ ہو نہ بننے سے کچھ"
گناہوں کے مابین بھی ہے وہ صاف
مقدر سے کرتا نہیں انحراف
کسی صدمے سے دل دہلتا نہیں
خوشی کی ذرا اُس کو پروا نہیں

مخالف ہو یا ہو موافق جہاں
جکڑتی نہیں کام کی بیڑیاں
جو قیدِ تمنا سے آزاد ہے
وہ ہر حال میں شاد و آباد ہے
جسے راستی سے محبت ہوئی
خود اپنی خودی سے بغاوت ہوئی
تو قربانی ہر فعل اس کا ہوا
یہی سعی تھی اور یہی مدعا
مٹا صفحۂ دل سے ہر نقشِ غیر
خود اپنے چمن کی تھی ہر لحظہ سیر
یہ قربانی اور سب لوازم برہم
جدا بھی برہم اور برہم ہی باہم
برہم کا اسے رتبہ حاصل ہوا
برہم سے بلاشبہ واصل ہوا
پجاری ہیں جس طور سے مختلف
طریقے ہیں قربانی کے مختلف!
چڑھاتا ہے گوشت اور دھواں کوئی بھینٹ
کوئی اس سے پاکیزہ تر شے کی بھینٹ

خود اپنی اُمنگوں کی قربانیاں
بخورات، جن میں نہیں ہے دھواں
پھر ان میں پجاری ہیں کچھ ایسے بھی
جو کرتے ہیں قربانی اس طرز کی
جلاتے ہیں پرہیزگاری کی آگ
حواسوں کی خوشیوں سے ہے جسکو لاگ
جو تھیں وجہ عشرت پئے چشم و گوش
وہ سب بہرِ پاکی تھیں مردودِ ہوش
جہاں آنچ کھائی بھسم ہو گئیں
فضائیں مکدر تھیں یا دھو گئیں
فروزاں کہیں مشعلِ راستی
جہاں بیدی ہے اپنے ہی ہردے کی
کہیں پریم کی اور جوانی کی بھینٹ
کہیں سکھ کی اور کامرانی کی بھینٹ
کوئی بھینٹ دولت کی کرتا ہے پیش
کوئی پونجی محنت کی کرتا ہے پیش
کوئی علم و عرفاں کا اندوختہ
بریشتہ جگر اور دلِ سوختہ

کہیں ہیں خموشی کی جاں سوزیاں
کہیں ہیں حبس دم کی دل افروزیاں
کہ وہ شمع روشن کرے گیان کی
جو پھیلائے عالم میں تابندگی
چلے سانس باہر تو دل لے اڑے
مڑے جب تجلی میں ڈوبی مڑے
نفس آمد و شد میں ضائع نہ ہو
پہنچتی رہے تقویت روح کو
کہیں ترک لذات و فاقہ کشی
ضرورت جو ہو نذر ہے جان بھی
بہائیں گوشت سے بڑھ کے قربانیاں
گناہوں کو دھونے کی خاطر یہاں
ملے بعد ازاں روح کو جو غذا
ذریعہ ہے وہ برہم سے قرب کا
برہم وہ کہ جس کو نہیں ہے زوال
ازل تا ابد جنبش یک خیال
نہ کی جس نے قربانی کوئی یہاں
وہ اک رائگاں فرد ہے بے گماں

جو بے فکرِ انجام ہو، کام ہے
وگرنہ گئے وقت کا نام ہے

رہے دھیان ارجن تو ہو شبہ دور
کہ جس جا یقیں ہے وہیں ہے شعور

جو قربانیاں علم کرتا ہے پیش
کہیں مال و زر سے ہیں قیمت میں بیش

یہاں کارفرما ہے عزم بلند
توانا دل اور طبع نیکی پسند

مگر ملتی اُس دم ہے یہ برتری
میسر ہو آگاہ کی رہبری

سعادت جہاں علم کی مل گئی
غلط کاریوں کی بھی تلخی مٹی

ہر اک چیز ہے راستی کی مطیع
تری ذات جس طرح میری مطیع

علاوہ بریں سُن رکھ اے ارجمند
ستاروں سے بھی جرم اگر ہیں دوچند
تو پھر بھی تجھے کشتی راستی
سمندر کے اُس پار پہنچائے گی

جلاتی ہے ایندھن کو جس طرح آگ
یونہیں گیان کو ہے گناہوں سے لاگ
کوئی چیز پاک ایسا کرتی نہیں
کہ جس طرح علم۔ اُس کے تابع یقیں
جو ڈھونڈے گا پائے گا اکدن ضرور
جو کامل ہے اکمل نہیں اُس سے دور
ملا علم جب تو ہوئی یک سوئی
نہ پھر جستجو تھی نہ شوریدگی
مگر علم سے جس کو بہرہ نہیں
کبھی میری جانب وہ دوڑا نہیں
یقیں کی جو نعمت سے محروم ہیں
دروں تیرہ، دوں ہمت و شوم ہیں
نہ عزت نہ ہمت نہ اکرام ہے
نہ اُمید سے کچھ انہیں کام ہے
وہ بندے ہیں شبہات و اوہام کے
گرفتار خود اپنے ہی دام کے
مگر جس کو اپنے پہ ہے اعتماد
تذبذب کو جو کہہ چکا خیر باد

خودی پر یہاں ہے جسے دسترس
صلے کی توقع کو سمجھا ہوس
نہیں روح پابند اعمال کی
نہ ماضی نہ مستقبل وحال کی
وہ روشن ضمیر اور آزاد ہے
وہی رونق بزم ایجاد ہے
یہ بندھن جو ہیں کاٹ بھارت کے پوت
ملی تیغ دانش تجھے اے سپوت
نہ دے دخل زنہار شبہات کو
رکھ اچھی طرح ذہن میں بات کو
کہ یہ ذریت ہیں ترے جہل کی
تجھے اِن سے ہوگی جبھی مخلصی
کہ جرأت سے اور عقل سے کام لے
بس اٹھ اور دامن مرا تھام لے
کریں مل کے رخ دونوں جنگاہ کا
وہ کر کام جو کام ہے شاہ کا

پانچواں ادھیائے

سنیاس یوگ

ثنا کام کے ترک کی ہے کبھی
ستائش کبھی بے غرض کام کی
یہ اب کہیئے گردھر کہ ان دونوں میں
کسے اختیار اور کسے رد کریں

یہ فرمایا سُن ارجن خوش نہاد
ہنر کیا ہے اور کیا ہے اِن میں سواد
یہ دونوں دکھاتے ہیں راہ نجات
نہیں ترک میں گو عمل کی سی بات

اُسے ترک میں چاہیئے انہماک
رہے نفرت اور خواہشوں سے جو پاک
جب اضداد سے بے نیازی ہوئی
گنوں کی وہیں ختم بازی ہوئی

عمل بھی ہو نیک اور نیت بھی صاف
نہ ہو فرق دونوں میں یا اختلاف
سمجھ ایک ہی سانکھ اور یوگ کو
حقیقت میں ہیں ایک، ظاہر میں دو
یہی ہے تقاضائے دانشوری
وہ ناداں ہے جس نے تفریق کی
کوئی راستہ ان میں کر اختیار
جو ہمت ہے مضبوط، عزم استوار
تو انجام دونوں کا ہے ایک ہی
نہ یہ اور نہ وہ راہ ہے پھیر کی
مگر منزل ترک دشوار ہے
یہاں بے غرض کام درکار ہے
اگر تربیت اس کی پائی نہیں
تو پھر تا بمنزل رسائی نہیں
چلا، ہو کے آگاہ جو راز سے
نہ تھا دور حق کے در باز سے
نہ کچھ ہے درنگ اور نہ کچھ باک ہے
عمل بے غرض، روح بھی پاک ہے

جسے کام آلودہ کرتا نہیں!
قدم راہ باطل میں دھرتا نہیں
حقیقت یہ جب دل نشیں ہو گئی
عمل کا ہے مقصود ترکِ خودی
تو چھونا ہو، سننا ہو، یا دیکھنا
کہ ہو کھانا یا پینا یا سونگھنا
وہ ہو سانس لینا کہ دم سادھنا
سفر یا حضر، سونا یا جاگنا
حواسوں کی بازی حواسوں سے ہے
یہ پیاسوں کی پکار پیاسوں سے ہے
برھمن کی جسے یاد ہے اُس کے کام
نتیجے سے رہتے ہیں فارغ مدام
یہ نشکام[1] ہی وجہ آرام ہے
یہی امن و راحت کا پیغام ہے
اسی واسطے شق کسی کام کی
نہیں روح کی وجہ آلودگی
تن و جاں سے پانچوں حواسوں سے بھی
رہا کرتی ہے جہد پیہم یہی

[1] ثمر کا خیال ترک کر کے اپنا فرض ادا کرنا

کہ آزاد ہو آتما قید سے
بدل جائے پھر یاس اُمید سے
خودی کو ہمیشہ مٹاتا رہے
حکومت کو اس کی اُٹھاتا رہے
وہ مرتاض جس کا عمل یہ ہوا
اُسے شانتی پھل عمل کا ملا
مگر خواہشوں کا بنا جو غلام
غرض پر ہے مبنی ہر اک جسکا کام
جکڑ کر وہ کرموں ہی میں رہ گیا
ہزاروں طرح کے الم سہہ گیا
حریم خودی کا مگر وہ مکیں!
گرفتار جو خواہشوں کا نہیں
وہ ہے جسم کے شہر کا شہریار
بصد شان و شوکت بصد اقتدار
کرے خود نہ دے حکم ہی کام کا
وہ دیوتا ہے بس فرق ہے نام کا
برہم نے عمل کو بنایا نہیں
عمل کا ہو بندہ سکھایا نہیں

نہ چاہا کوئی چاہے پھل کام کا
وسیلہ اسے سمجھے آرام کا
یہ سب نفس انسان کی ایجاد ہے
خود انساں پر انساں کی بیداد ہے
کوئی فعل اچھا ہو یا ہو برا
برہم سے ہے منسوب کرنا خطا
وہ بالا ہے اس سے بھی اور اس سے بھی
نہ اس سے ہے نیکی نہ اس سے بدی
یہ انسان جاہل، خطا کار ہے
جہاں چاہیئے دن، شب تار ہے
پڑی تیز جب علم کی روشنی
وہیں روح کی تیرگی دھو گئی
افق پر نمایاں ہوئی راستی
لئے نور عرفاں کی تابندگی
جھلک اٹھیں روحیں، اجالا ہوا
بھٹکتی تھیں یا راستہ مل گیا
تصور برہم کا، اسی کی تلاش
معیشت وہیں اور وہیں بود و باش

رہا گمرہی کا نہ کچھ احتمال
قدم کوئی بہکا پڑے، کیا مجال
بفیضِ یقیں بڑھ گیا حوصلہ
گناہوں کا پشتارہ پھینکا گیا
نہ میرے لئے اور نہ تیرے لئے
یہ ہے روشنی عام سب کے لئے
برہمن ہو عالم، مگر بے زباں
نجس کتا، گائے اور ہیل دماں
ملیچھ گوشت کتّے کا کھاتا ہے جو
یہ سب ایک ہیں چشمِ بینا جو ہو
دو عالم پہ وہ فتح پاتا رہا
جو یکتائی سے لَو لگاتا رہا
کہ یکتائی کا شانہ ہے برہم کا
یہ ہے برہم کا، رتبہ دیکھو ذرا!
خوشی ہو اگر، تو نہ خوش ہو بہت
نہ دے وقتِ غم، دخل غم کو بہت
رہے ذات یکتا پہ کامل یقیں
یقین ہے تو سب کچھ ہے زیرِ نگیں

رشی جس نے قطع تعلق کیا
رہا ماسوا سے نہ کچھ واسطہ
دوامی تھی راحت، دوامی خوشی
کہ پاکی کی نعمت تھی اور روح تھی
حواسوں پہ جن خوشیوں کا ہے مدار
رحم ہیں کہ بے نطفہ جس میں قرار
گراں بارِ غم کب وہ رہتا نہیں
الم کون سے ہیں جو سہتا نہیں
وہ خوشیاں جو دم میں فنا ہو گئیں
وہ ذی ہوش کا دل لبھاتی نہیں
جسے خشم و شہوت پہ قابو رہا
نہیں جسم کی قید سے گو رہا
مبارک ہے وہ مردِ دانائے راز
کہ ہے نیک و بد میں اُسے امتیاز
وہی یکت[1] ہے اور آزاد ہے
وہی خرم و شاد و آباد ہے
ہوئی برھم میں جذب اُس کی حیات
نہیں دور نروان[2] سے اُس کی ذات

[1] واصل بحق ۔ [2] مکتی ۔ نجات ۔

رشی اپنی آرام گاہوں میں تھے
گناہوں کے جب داغ دل سے مٹے
محل تیرہ شبہات کے ڈھ گئے
سکوں رہ گیا اور وہ رہ گئے
خیالات فاسد ہوئے دل سے دُور
طبیعت ہوئی لذتوں سے نفور
جہاں مر گئے اس طرح حسیات
میسّر ہوئی جاودانی حیات
میاں دو ابرو نظر جم گئی
جہاں پر تھی دُنیا وہیں تھم گئی
تنفس میں پیدا توازن ہوا
کشاکش کے بدلے تعاون ہوا
پران[1] اور اپان[2] ایک حالت میں تھے
نہ کمزور تھے اور نہ طاقت میں تھے
ہوئے متحد عقل و ہوش و حواس
نظر خود نگر، قلب یزداں شناس
نہ بیم و رجا اور نہ حرص و ہوا
یہ اُن سے الگ اور وہ اُس سے جُدا

[1] اندر جانے والی سانس۔ [2] باہر آنے والی سانس۔

علاقہ نہ دنیا سے کوئی رہا
ریاض جناں جیتے جی مل گیا
مری قدر جانی وہ عارف ہوا
مرے واسطے یگ گیا نفس کا
نمونہ ہوا اس کی میں ذات کا
جو خالق ہے ارض و سمٰوات کا
کسی سے نہ کچھ رابطہ رہ گیا
فقط مجھ سے اک واسطہ رہ گیا
وہ میرا ہوا اور میں اُس کا ہوا
ملی شانتی اور یکتا ہوا

چھٹا ادھیائے

دھیان یوگ

جسے دھن رہا کرتی ہے کام کی
نہیں فکر کرتا وہ آرام کی!
وہی کام کرتا ہے جو چاہیئے
نہ مطلب صلے سے نہ آرام سے
وہی سنیاسی ہے یوگی وہی
نہ وہ جو ہو تصویر بیچارگی
جسے لوگ ہیں ترک سمجھے ہوئے
حقیقت میں اسلوب ہیں کام کے
کہ جب تک نہ ہو ترک مطلب یہاں
نہ ہو کام کا اصل جوہر عیاں
نہ کرنا یہاں پیش قربانیاں
فقط بے حسی ہے کہ نادانیاں

وہی ترک ہے اور وہی یوگ ہے
نہیں ترک تو یوگ آبھوگ[1] ہے
چڑھاتا ہے وہ یوگ کے جام کو
وسیلہ بناتا ہے جو کام کو
نہ ہو کام جب تک تو ملتی نہیں
وہ نعمت کہ ہے نام جس کا یقیں
مگر یوگ جس وقت کامل ہوا
تو پھر ٹھہرا کامل سکوں مدعا
حواسوں کی جب سرکشی مٹ گئی
تو جو دلکشی اُن میں تھی مٹ گئی
نہ پھر کام کا حوصلہ رہ گیا
امنگیں نہ وہ ولولہ رہ گیا
یہ تکمیل کا یوگ کی ہے مقام
نہیں اس میں زنہار جائے کلام
خودی کے علو میں ہے عزت تری
خودی کی ہے پستی میں ذلت تری
تو ہی دوست اپنا ہے دشمن تو ہی
نہیں ماسوا دوست دشمن کوئی

[1] لاحاصل ۔

وہ اپنا ہے فاتح وہ اپنا ہے میت
وگرنہ یہاں کون کس کا ہے میت
سرکوہ جیسے کوئی ہو مقیم
نہ ہم جنس کوئی نہ کوئی ندیم
جہاں یکسوئی دل کو حاصل ہوئی
تو پرماتما آتما ایک تھی
خوشی کا تھا دخل اور نہ غم کا اثر
نہ گرمی نہ سردی نہ خشک اور نہ تر
نہ عزت نہ ذلت کی پروا رہی
وہی مُکت ہے اور یوگی وہی
جہاں نورِ عرفاں ضیا بار ہے
وہاں خار بھی رشکِ گلزار ہے
جہاں راستی جلوہ افگن رہے
بجز راستی کس کا مسکن رہے
جسے نفس پر اپنے قابو ہوا
حریف اس کا ہو کون اس کے سوا
وہ اُن رفعتوں پر ہے مسند نشیں
جہاں کیف و کم کا گزر ہی نہیں

وہاں سنگ اور سیم و زر ایک ہیں
خزف ریزے ہوں یا گہر، ایک ہیں
نہ دوست اور نہ دشمن کوئی رہ گیا
بجز آتما رو میں سب بہ گیا
کرم اُس کا یکساں رفیقوں پہ ہے
شناساؤں اور اجنبیوں پہ ہے
سلوک ایک بیری پریمی سے ہے
بدیشی سے اور دیش بھگتی سے ہے
وہی اپنے سے بھی پرائے سے بھی
محبّت سبھی سے ہوئی ایک سی
بدی سے بھی نیکی سے بھی آشتی
پیام اُس کا ہے پریم اور شانتی
اثاثہ نہیں مال و دولت نہیں
میسّر مگر کون نعمت نہیں
جُدا سب سے ہے سب میں شامل بھی ہے
وہ جادہ بھی ہے اور منزل بھی ہے
لیے یوگ لازم ہے جائے خموش
جہاں ہو نہ ہنگامہ آرا خروش

جگہ چاہیئے صاف ستھری بہت
تو بیٹھک نہ اونچی نہ نیچی بہت
جو اسباب دُنیا سے کچھُ پاس ہے
ہری گھاس اور ایک کرباس ہے
بچھانے کو اک مرگ چھالا بھی ہے
یہی شال بھی ہے دوشالا بھی ہے
دو عالم سے دل کو اٹھائے ہوئے
حواسوں پہ آسن جمائے[1] ہوئے
اکیلے میں آراستہ بزم ناز
وہی جلوہ گر ہے، وہی جلوہ ساز
وہاں شمع عرفاں جلائے ہوئے
وہ ہے دھیان مجھُ سے لگائے ہوئے
زباں کہنے میں اور قابو میں دل
سکوت و سکوں متصل مستقل
نہیں کچھ سر و پا کی اپنے خبر
جمی ہے سوئے نوک بینی نظر
مناظر مظاہر سے پروا ہوا
خود اپنا ہی محو تماشا ہوا

[1] آسن جمانا۔ قابو پانا۔

نہ اب روح کو صدمۂ اضطراب
نہ اب خوف سے دل کی حالت خراب
پرھیجاری[1] جب میرا جویا ہوا
مجھی میں تھا دن رات کھویا ہوا
وہ یوگی جسے اتنا مقدور ہے
ہوا و ہوس سے بہت دور ہے
ہر اک لحظہ اپنی نگہداریاں
طلبگاریاں اور بیداریاں
وہ امن و سکوں اُس کو حاصل ہوا
جو امن و سکوں سے بھی ہے ماورا
نئی آن ہے اور عجب شان ہے
جو میرا ہی اس کا نروان ہے
غلط یوگ اُس کا جو فاقہ کرے
اور اُس کا بھی جو ڈٹ کے کھایا کرے
اور اُس کا جو شکتی مٹاتا رہے
لہو اپنے تن کا جلاتا رہے
یہاں اصل میں وہ ہے پرہیزگار
کہ ہے خدمت خلق جس کا شعار

[1] متلاشی حق، نفس امارہ پر قابو پانے کا جتن کرنے والا۔

جو دُکھ درد سب کا مٹاتا رہے
نقوشِ خودی کو مٹاتا رہے
بہت کھانا پینا ہے وجہِ ملال
سو رکھتا ہے مدِ نظر اعتدال
ہر اک خواہش و فعل ہے معتدل
ہر اک شغل اور کھیل ہے معتدل
سویرے سے بستر پہ جا لیٹنا
سویرے سویرے ہی اُٹھ بیٹھنا
جہاں جس کا ایسا ہے طرزِ عمل
کہ پڑتا نہیں آتما میں خلل
حقیقت سے اُس کو ہوئی آگہی
خیالات کا روح مرکز رہی
اُسے یکت کہنا ہی زیبا ہوا
کہ جب مل چکا سب، تنہا ہوا
دیا ہے ہوا سے جو محفوظ ہے
یوہیں دل بھی یوگی کا محفوظ ہے
حواسوں کے طوفان آتے رہے
مگر جوت اس کی بڑھاتے رہے

خیالوں میں ضو شانتی کی رہی
صفا پروری اور پاکی رہی
خودی کا نظارہ خودی کو رہا
تصوّر میں آنند پانے لگا
خوشی کا ہوا رابطہ روح سے
حواسوں کے عقدے جو تھے کھُل گئے
نکالے جہاں راستی نے یہ پیچ!
لگا ہوں میں دُنیا کی دولت تھی ہیچ
تذبذب، تامل نہ گمراہیاں
وہ تھا عزم وہمّت کا کوہ گراں
کوئی وسوسہ پاس آتا نہیں
کوئی زلزلہ دل ہلاتا نہیں
یہی یوگ یا منزل امن ہے
وہ یوگی ہے کی جس نے یہ راہ طے
ثبات قدم اس کو درکار ہے
کہ یہ مرحلہ سخت دشوار ہے
خیالوں کی چوبائیاں ختم تھیں
یہ خوابوں کی رعنائیاں ختم تھیں

تمنا رہی اور نہ کاہش رہی
نہ شہرت کی بیہودہ خواہش رہی
حواسوں کا دروازہ تیغا ہوا
تپسیا کا پہرا بٹھایا گیا
بتدریج راہ اماں مل گئی
وہ ہنگامہ آرائی دل گئی
خود اپنے میں ڈوبا ہوا آپ تھا
تصور بھی عصیاں کا اک پاپ تھا
ہر اک بوجھ سے روح ہلکی ہوئی
خود اپنے ہی انوار میں محو تھی
بلاشبہ دل کی کبھی خود سری
بغاوت پہ کرتی ہے آبادگی
یہ بنتا ہے صیدر میدہ کبھی
باندازِ بسمل تپیدہ کبھی
یہ پھر صید اور روح صیاد ہو
دوبارہ نہ بندش سے آزاد ہو
بغیر سکوں مکتی ممکن نہیں
فقط رات ہی رات ہے دن نہیں

نہ ہو گر علائق سے وارستگی
نہ ہو روح اعظم سے وابستگی
گناہوں سے جس دم کنارہ ہوا
وہیں اُس طرف سے اشارہ ہوا
برہم سے ہوا جس گھڑی اتحاد
خودی اُٹھ گئی اور شور تضاد
میں ہی سب میں تھا اور سب مجھ میں تھا
نہ میں اُس سے اور وہ نہ مجھ سے جُدا
نہیں چھوڑتا وہ سہارا مرا
چرن ہیں مرے اور دوارا مرا
جہاں بھی رہے اور جیسا رہے
طریقہ جو کچھ زندگی کا رہے
مجھی میں رہا اور مجھی میں جیا
کہ واقف ہے مجھ سے پجاری مرا
میں ہی زندگی ہوں ہر اک زندہ میں
میں ہی تابناکی ہوں تابندہ میں
سن ارجن جسے چشمِ بینا ملی
یہ سمجھا فقط ایک ہے زندگی

مثال اُس کی موجود ہے اُس میں ہی
کہ ہے ایک لیکن ہے کیا کیا وہی
حقیقت میں رنج اور خوشی ایک ہے
یہاں جوہر اور جوہری ایک ہے
اُسے بے تامل تو یوگی سمجھ
سمجھ اُس کو پھر اُس کی خوبی سمجھ
وہ قطرہ ہے دریا ہے جس میں نہاں
وہ جلوہ ہے گم جس میں کون و مکاں

یہ کی عرض ارجن نے شاہا سنے
جو اسرار ہیں کرم اور یوگ
مگر کیا کروں اے خبردار کار
نہیں ایک حالت پہ دل کو قرار
میں اس تند و سرکش سے مجبور ہوں
سمجھتا نہیں لاکھ بکتا رہوں
سراسیمگی اور بیچارگی!
مری زندگی ہے عجب زندگی
یہ ممکن ہے پھندا ہوائیں لگے
مگر دل پہ مشکل ہے قابو چلے

کِشن بولے سیماب پارہ ہے دل
مجسم تپش یا شرارہ ہے دل
نہیں آتا قابو میں یکبارگی
نہ کر پھر بھی اقرار بیچارگی
رہے سعی جاری تو ہوتا ہے رام
باندازِ صید گرفتارِ دام
ارادہ ہو مضبوط لازم یہ ہے
قوی ہے اگر عزم، خادم یہ ہے
نہیں کوئی شک یوگ آساں نہیں
لق و دق ہے صحرا گلستاں نہیں
خصوصاً ہیں جو لوگ آتش مزاج
بدقت وہ لیتے ہیں اس سے خراج
مگر خوئے بیکار ڈالی جہاں،
تو ہوگا ضرور ایک دن کامراں

پھر ارجن نے پوچھا کہ اے چارہ ساز
یہ ارشاد ہو دل ہے جس کا گداز
وہ رکھتا بھی ہو یوگ پر اعتقاد
وہ کرتا رہے نفس سے بھی جہاد

رہے پھر بھی ناکام وہ نامراد
پھرے مضطرب صورتِ گرد باد
سحر ہے کوئی اس کی بھی شام کی
کوئی شکل اس کے بھی آرام کی؟
رہا صرف حرمان و غم اس جگہ
پس از مرگ پہنچے گا وہ کس جگہ
کہا محو تسلیم کی بعد مرگ
بلاشبہ جائے اماں ہے سورگ
جسے نفس سے اپنے ہے آگہی
وہ گم کردہ منزل نہ ہوگا کبھی
وہ جنت میں رہ کر ہزاروں برس
نئی زندگی پاتا ہے باز پس
دوبارہ بسر کرنے کو ماہ و سال
امیروں کے گھر میں جو ہیں خوش خصال
کہ لیتا ہے یوگی کے گھر میں جنم
مگر اتفاق ایسا ہوتا ہے کم
یہاں وقف رہتی ہے اس کیلئے
وہ دانش جو حاصل تھی پہلے اُسے

بدستور ہے آرزوئے کمال
وہی جہد اور جستجوئے کمال
یوہیں پلے بہ پلے لے کے کتنے جنم
وہ آخر کو ہوتا ہے مجھ سے بہم
جو یوگی ہے تیاگی سے برتر ہے وہ
گنی اور گیانی سے بہتر ہے وہ
مرے پیارے ارجن یہی سعی کر
لقب سے ہو یوگی کے تو بہرہ ور
وہی یوگیوں میں ہے یوگی بڑا
تہ دل سے پیرو جو میرا ہوا

مرا دھیان رہتا ہے ہر دم جسے
نظر مجھ میں آتا ہے عالم جسے

ساتواں ادھیائے

وگیان یوگ!

اگر یوگ کی مشق ہوتی رہی!
اور ارجن تجھے مجھ میں کھوتی رہی
ترا دھیان مجھ سے لگا ہی رہا
یہی رنگ روشن نگا ہی رہا
تو یہ جان لے مجھ سے مل جائیگا
کسی حال میں پھر نہ ہوگا جُدا
بتاؤں تجھے اب وہ عرفاں کے راز
کہ خود علم و دانش کو ہے جن پہ ناز
کسی کا نہ محتاج ہوگا کبھی
کہ یہ آخری ہیں حدیں علم کی
رہا کرتی ہے سب کو اپنی تلاش
وہ کم ہیں جو کرتے ہیں میری تلاش

جو کرتے بھی ہیں اور بڑھتے بھی ہیں
عبارت اشارت کو پڑھتے بھی ہیں
مجھے پاتے لاکھوں میں ہیں دو کہ ایک
کہ ہوتے نہیں! ایسے دانا انیک
وہ ہیں شاذ و نادر جو سمجھے یہاں
کہ عالم کی ہستی کا ہوں میں نشاں
زمیں آب و آتش، ہوا، چار ہیں
پھر ایتھر بدھی من اہنکار ہیں
انہیں آٹھوں سے ہے جہاں کی نمود
نہ ہوں یہ تو ہے حرف مہمل وجود
عیون و مظاہر ہیں میرے یہ سب
مجھی میں ہے پوشیدہ ان کا سبب
مجھی سے ہے مضمر بھی ان میں فساد
خرابی یہ قائم ہے ان کی نہاد
مگر یہ تو ادنیٰ ہے طینت مری
سمجھ اب تو اعلےٰ حقیقت مری
یہ دُنیا کہ شکتی سے معمور ہے
یہاں آفرینش کا دستور ہے

ہوا کرتی ہیں خلق اشیا یہاں
کہ جیسے گربھ سے ہو بچہ عیاں
وہی البطن یعنی وہ "یونی" ہوں میں
کل اشیائے عالم جہاں جمع ہیں
بناتا ہوں میں اور مٹاتا ہوں میں
اسے حسب منشا چلاتا ہوں میں
میں ہی اس جہاں کا ہوں مختار کل
کوئی شمع روشن، کوئی شمع گل
یہ سب مجھ سے وابستہ ہیں اس طرح
کہ سِلک گہر میں گہر جس طرح
میں ہی آبِ تازہ کا ہوں ذائقہ
میں ہی ماہِ سیمیں میں اس کی ضیا
میں ہی مہر کی ہوں سنہری کرن
میں ہی وید کا ہوں مقدس سخن
میں ہی بحرِ ایشر کی ہوں تھرتھری
میں ہی شکتی "انسان کے بیج" کی
میں ہی دھرتی کی سوندھی سوندھی سوگند
میں ہی آگ کا شعلۂ سربلند

میں ہی ہوں حیات اور نسیمِ حیات
وہ پائی ہے روحوں کو جس سے ثبات
وہ ہوں اصل جس کو فنا ہی نہیں
کہ خود زیست ہے میری منت گزیں
میں ہی اہلِ دانش کی دانش وری
میں ہی ذہنِ عارف کی حق پروری
جو برتر ہیں اُن کی ہوں میں برتری
جو مشہور ہیں اُن کی شہرت وری
بسر گنتی کے مجھ میں ہیں یہ سبھی
مگر میں تمناؤں سے ہوں بری
نہ خواہش ہوں میں اور نہ کاہش ہوں میں
طلب ہے جو صادق تو بخشش ہوں میں
طبیعت ہو آمادہ جس کی جدھر
سکوں آشنا، پُر ہوس، بے خبر
وہ سب جذب مجھ میں ہیں اور مجھ سے ہیں
وہ مجھ سے ہیں لیکن نہیں ان سے میں
سہ گونہ مظاہر کا کھا کر فریب
یہ انسان جو ہے بڑا ناشکیب

سمجھتا نہیں ان سے باہر ہوں میں
یہ سب ہیں عرض[1] اور جوہر[2] ہوں میں
یہ دُنیا ہے، دنیا کا یہ نقشہ ہے
کہ ہر جلوہ اپنی جگہ پردہ ہے
گزرنا حجابوں سے اک کام ہے
کہ ہر ہر قدم پر نیا دام ہے
مدد سے مری کرتے ہیں پردے چاک
گزر جاتے ہیں پار بے بیم و باک
جو بد ہیں وہ آگاہ مجھ سے نہیں
سفیہوں کو بھی راہ مجھ سے نہیں
نہ کم ظرف و سرکہ جبیں کو ہے راہ
نہ ظاہر نگر ناخوردہ بیں کو ہے راہ
نہ وہ جن کا مسلک اسورِ بدوں[3] کا ہے
شیاطین سے جو ملاتے ہیں لے
جو مجکو یہاں سمجھے وہ کردہ کار
بتاتا ہوں، سُن، اُن کی قسمیں ہیں چار
وہ انساں جو ہے غم کا مارا ہوا
وہ انسان جو لب تشنہ ہے علم کا

[1] تغیر پذیر، فانی ؛ [2] قائم بالذات، لافانی ؛ [3] منکرین خدا ؛

حقیقت کا جویا جو انسان ہے
وہ انساں جسے ذوقِ عرفان ہے
یہ سب مستحقِ کرامت ہوئے
کہ بیگانۂ عیش و راحت ہوئے
عظیم ان میں ہے عارفِ ذی شعور
حضوری سے دم بھر نہیں ہے جو دور
اُسے میں سمجھتا ہوں میں آپ ہوں
کہ ہے پاک طینت وہ روشن دروں
مکمل توازن کا آئینہ دار
وہ اپنی خودی کا ہے پروردگار
پُراتم ہیں کم جو بلا ریب و ریو
یہ کہہ دیں کہ "جو کچھ ہے وہ واسدیو"[1]
کچھ ایسے ہیں خواہش ہے جن کی مشیر
بھٹکتا ادھر اور اُدھر ہے ضمیر
سمجھتے، ذرا بھی اگر سوچتے
بچارے ہیں کم رتبہ دیوتاؤں کے
اگر یوں بھی راسخ عقیدہ ہوا
تو یہ بھی ہے میرا ہی بخشا ہوا

[1] وہ ہستی جو کائنات میں ہر جگہ سما رہی ہو۔

اسی کی بدولت وہ پُر جوش ہیں
مرادوں سے اپنی ہم آغوش ہیں
مرادیں بھی ہیں میری ہی دی ہوئی
بہت کم ہے گو ان کی پائندگی
حقیر ان کا پھل بھی ہے ان کی طرح
کہاں سربلندوں کی بانکی طرح
جنہیں پوجتے تھے انہیں پا گئے
جہاں خود وہ پہنچے تھے پہنچا گئے
جو میرے ہیں آتے ہیں وہ میرے پاس
تمنا نہ خواہش نہ بیم و ہراس
وہ اندھے ہیں جن کو ہوا ہے گماں
عیاں ذات میں اپنی میں ہوں یہاں
جو مطلق ہے اُس کا ہو کیونکر ظہور
کہ حدِ تعین سے ہوں کوسوں دُور
تماشاگہِ دہر ہے خود حجاب
نظر کے مقابل طلسمی نقاب
نہ واقف ہے کوئی نہ کوئی علیم
کہ حادث ہیں سب ایک میں ہوں قدیم

مجھے علم سب کا مَیں سب کا سبب
ہُوا جو، کہ ہو گا، کہ ہوتا ہے اب
یہاں جو ہے پیرو ہَے اضداد کا
نشاط و الم، داد بیداد کا
یہ شے ہے پسند اور یہ ناپسند
جو ہے نفع اس میں تو اُس میں گزند
فریب بد و نیک کھائے ہوئے
ہمیشہ ہیں وہ چوندھیائے ہوئے
مگر چند ایسے بھی ہیں مرد کار
گناہوں سے آزاد، پرہیز گار
جو دانا ہیں اور بے نیازِ تضاد
یقین جن کا محکم، قوی اعتقاد
سدا میری جانب پلٹتے رہے
وہ چرنوں سے میرے لپٹتے رہے
کہ جنموں کے چکر سے پائیں نجات
نہ مرنا رہے اور نہ جینے کی گھات
جو تھی برہم کی وہ ڈگر مل گئی
پھر ادھیاتم[1] اور کرم کی سُدھ ہوئی

[1] روح پاک ؛

ادھی[1] بھوت بھی دل سے مانا مجھے
ادھی دیو[2] اور ادھی یگ[3] بھی جانا مجھے
جو یوں جانیں گے، وہ مجھے جانیں گے
دمِ مرگ بھی مجکو پہچانیں گے

---

[1] ظاہری ۔ مادی کالبد ۔ فانی جسم ؛ [2] جیو آتما، روح انسانی ؛ [3] ایسی انسانی روح جس کے جملہ کام طبعی طور پر انانیت کے جذبہ سے پاک ہو کر راہ خدا میں ہوں ؛

آٹھواں ادھیائے

سُدھ یوگ

سُنا جب سری کشن سے ماجرا
تو ارجن نے بے ساختہ یہ کہا
"برہم" کیا ہے "ادھیاتم" اور "کرم" کیا
"ادھی بھوت" کا بھی نہ مطلب کھلا
"ادھی دیو" کیا اس کا مفہوم کیا
"ادھی یگ" نہ معلوم کس کو کہا
مدھو کے کشندہ یہ بتلائیے
علاوہ بریں یہ بھی فرمائیے
دم مرگ دھو نے کو نیکوں کے پاپ
انہیں دیتے درشن ہیں کس طرح آپ
یہ کہنے لگے کشن عالی مقام
سُن ارجن جو تھا مدعائے کلام

میں ہوں "برھم" جاوید و مطلق خدا!
مری ہستئ ذات "ادھیا تما"
یہی ہے جو ہے روح کی روح بھی
یہی جیو، قوت ہے تخلیق کی
مجھے اس بنا پر ہیں کہتے "پرش"
کہ ہوں نیر دے آفرینش سے خوش
ہُوا مختلف روپوں میں آشکار
کیا نام "ادھی بھُوت" یوں اختیار
میں ہی زندگی کا شہنشہ ہُوا
"ادھی دیو" دیوتاؤں کا دیوتا
"ادھی یگ" ہوں قربانیوں کا خدا
میں ہی دے گیا اور میں ہی لے گیا
اٹھے مجھُ سے اور مجھ میں شعلے بجھے
وہ کہنے کو مندر کہ دل سے اُٹھے
جسے مرتے دم تھا تصوّر مرا
ملا مجھُ سے جب قیدِ تن سے چھٹا
ہوا مجھُ سے ہم رشتہ اُس کا وجود
ہوئی میری ہستی میں اُس کی نمود

وہ پاتا ہے جس کو ہے جس کی تلاش
یہاں ہے یہی جستجو کا قماش
مجھے دھیان میں رکھ اسی ڈھنگ سے
جو ہے مرد وہ کیوں ڈرے جنگ سے
اگر جان و دل سے بھروسا رہا
تو یہ جان لے مجھ سے تُو آ ملا
وہی پاتے ہیں خوش عقیدہ جو ہیں
تیقین کے لذت چشیدہ جو ہیں
جو مجکو سمجھتے ہیں اور جانتے
خدا دوسرے کو نہیں مانتے
پُرش ہوں کہ اعلیٰ کہ پاکوں کے پاک
مجھے ڈھونڈھتے ہیں بصد انہماک
مغنّی و عارف کا میں ہوں خدا
قدیم۔ اور ٹھہراؤ ترلوک کا
حدود تعین سے باہر ہوں میں
مگر ذرے ذرے کے اندر ہوں میں
مجھی سے تڑپ ہے مجھی سے تپش
مجھی سے ہے رم اور مجھی سے کشش

میں جیسا ہوں کوئی اگر دیکھ لے
وہ دیکھے جو دیکھا نہ ہو آنکھ سے
چمک شعلۂ مہر سے بھی سوا
کہ وہ تو فقط زر ہے پگھلا ہوا
پے چشم ہے اُس کی تابندگی
مری روشنی روح کی روشنی
جہاں ظلمتیں روح کی مٹ گئیں
شعاعیں حقیقت کی پھوٹیں وہیں
تن و جاں میں ہونے لگا جب فراق
نہ تھا مثل جینے کے مرنا بھی شاق
نہیں اس کے دل کو ذرا انتشار
کہ ہے مطمئن روح پرہیزگار
تلاطم نفس میں نہ چتون پہ میل
نہ شبہات داوہام تھے سیل سیل
جہاں بے قراری تھی اب امن تھا
کہ وہ کام سے اپنے فارغ ہوا
وہاں پہنچا جنت جو رشوں کی ہے
وہی "اکش آرم" بھی ویدوں کی ہے

وہی ایک ہے ترکِ عرفاں کی راہ
نہیں اختلاف اس میں یا اشتباہ
مقفل حواسوں کے در ہو گئے!
محل خواہشوں کے کھنڈر ہو گئے
مقدس برہم کا ہے گلدستہ "اوم"
لہذا لبوں پر ہے آہستہ "اوم"
رواں تن سے ہوتی ہے یوں جانِ پاک
کہ رخصت ہو نجم سحر تابناک
اٹھا کر جو ہاتھ اور دیوتاؤں سے
لگا رہتا ہے دھیان میں بس مرے
بہت سہل ہے اُس کو پانا مرا
ملے پر ہے مشکل بھُلانا مرا
دوبارہ وہ دنیا میں آتا نہیں
وہ پھر دُکھ جنم کے اٹھاتا نہیں
میسر ہوئی جس کو میری پناہ
تو پھر وہ ہے اور شانتی ہے اتھاہ
یہ دنیائیں ارجن پلٹتی ہیں پھر
بدلتی ہیں، بنتی ہیں، مٹتی ہیں پھر

یہ دنیائے برھما کی بھی رسم ہے
اُجاگر کبھی اور کبھی بھسم ہے
کبھی موت ہے اور کبھی زندگی
اندھیرا کبھی ہے، اُجالا کبھی
مگر پہنچا مجھ تک جو گنتی کے لال
کمال اُس کو پھر ہے نہ اُس کو زوال
ہزاروں جُگ اور ایک برھما کا دن
ہزاروں ہی پھر گن تو اک رات گن
کُھلے تب کہ دن رات کیا ہیں یہاں
سحر کیسی ہے، کیا ہے شب کا سماں
سحر یہ کہ نا دیدہ ظاہر ہوا
ہر اک راز پوشیدہ ظاہر ہوا
یہ ہے شب، عیاں پھر نہاں ہو گیا
بطونِ فریسندہ میں سو گیا
اُمڈتی ہوئی زندگی کا ہجوم
یہ کثرت کہ جیسے فلک پر نجوم
شب برھما میں سب کو سونا پڑا
سحر گاہ بیدار ہونا پڑا

کوئی شاد ہو، خواہ ناشاد ہو
یہ ممکن نہیں اس سے آزاد ہو
پر اک زندگی اس سے برتر بھی ہے
اسی بحر میں ایسا گوہر بھی ہے
حواسوں کی چھل جس سے چلتی نہیں
کسی حال میں جو بدلتی نہیں
مظاہر سے آلودہ ہوتی نہیں
یہ اس طرح آسودہ ہوتی نہیں
تعین تغیر سے بالا جو ہے
مکمل ہے اور سب سے اعلےٰ جو ہے
جو اس سے ملا پھر نہ پلٹا کبھی
وہاں میں ہوں، وہ ہے مری زندگی
یقیں جس کو لغزش نہ ہو، جادہ ہے
وہ آئے جو آنے پر آمادہ ہے
پُرش[1] میں ہوں، یہ کائنات بسیط
مجھی میں ہے اور میں ہوں اس پر محیط
جو پہنچا یہاں، بھید وہ پا گیا
فنا و بقا دونوں پر چھا گیا

۱؎ جیو آتما۔

یہ ہے وید سے بڑھ کے دانشوری
تپسیا، تیاگ اور دعا سے بڑی
وہ یوگی جسے علم اس کا ہوا
سکونِ مکمل ہیں یکتا ہوا

نواں ادھیائے

راج یوگ

مری باتوں سے اوبتا تُو نہیں
غلط نکتہ چینی تری خو نہیں
بتاتا ہوں اب تجکو وہ گہرے راز
جو ہیں دونوں عالم کے آئینہ ساز
جنہیں جاننا ہی ہے آبِ حیات
برائی سے دیتے ہیں فوراً نجات
یہ سب سرِ مخفی و شاہانہ ہیں
لیے زندگی شمع کاشانہ ہیں
تجلی فروز و تجلی نشاں!
جہاں یہ ہیں تاریکیاں پھر کہاں؟
نہیں کوئی مشکل سمجھنا انہیں
سمجھ کر ہے آساں برتنا انہیں

نظر میں یہ جس کی ہوئے نا قبول
نہیں اس کو نعمت یقیں کی حصول
اُسے عقل عالی سے کیا رابطہ
رسائی کا مجھ تک نہیں راستہ
تسلط میں وہ جسم فانی کے ہے
وہ چکّہ میں دورِ زمانی کے ہے
یہ عالم ہیں میرے بچھائے ہوئے
مجھی میں یہ سب ہیں سمائے ہوئے
مگر میں کوئی جزو ان کا نہیں
یہ میرے ہیں میں ان کا بند نہیں
کہ میں ان سے اور سب سے ہوں ماورا
یہ وابستہ مجھ سے میں ان سے جدا
یہ لے ساحلوں کی ہواؤں کا بحر
فضا میں ہے دوڑی ہوئی جس کی لہر
ہوا کی یہ موجیں فضا تو نہیں
فضا اور شے ہے ہوا تو نہیں
اسی طرح سب چیزیں مجھ میں تو ہیں
نہ تھا اُن سے میں اور نہ ہوں اُن سے ہیں

ہر اک کلپ[1] کے خاتمے کی طرف
پلٹتی ہیں سب چیزیں میری طرف
اسی طرح آغاز میں کلپ کے
نکلتے ہیں پھر آفریدہ مرے
دکھاتا ہوں پرکرت[2] کے ایسے ڈھنگ
کہ بے رنگ جلوے میں پیدا ہو رنگ
چلاتا ہوں دھرتی کے ہر کام کو
دیا کرتا ہوں گردشِ ایام کو
یہ سب کچھ ہے پھر بھی ہوں اُن سے جدا
نہیں ان کے بندھن میں جکڑا ہوا
بلند اور برتر ہوں آزاد ہوں
کہ میں ذات میں اپنی آباد ہوں
کھُلا کارخانہ ہے تخلیق کا!
مرے دستِ قدرت کا ڈھالا ہوا!
جمود و ترقی، حیات و ممات
یوہیں چلتی رہتی ہے کل کائنات
جو واقف نہیں اُن کو ہے یہ گماں
کہ میں خود ہوں پردے میں اُس کے نہاں

[1] دور زمانہ از ازل تا ابد - برہما کا ایک دن ؛ [2] مایا، تبدیلی پذیر کائنات کا بنیادی سبب ؛

3 پتے کی جو ہے بات سوجھی نہیں
4 پہیلی کبھی میری بوجھی نہیں
1 نہیں جسم و امثال کا میں غلام
2 یہاں کے نہیں کام دھندوں سے کام
فضول آرزوؤں کا چیلا کوئی
1 تو بیہودہ کاموں میں الجھا کوئی
1 نہ علم ان کا گہرا نہ اچھے عمل
3 نہ یہ ہے سپھل اور نہ وہ ہیں سپھل
2 بری راہیں کرتے ہیں سب اختیار
2 یہاں تم کہ بھوتوں کا ہے طرز کار
1 کچھ ایسے بھی ہیں جو ہیں محو سپاس
عبادت گزار و غلط ناشناس
2 کسی سے الجھتے اٹکتے نہیں
3 کسی حال میں ہوں، بھٹکتے نہیں
1 مجھی کو بصد نازشِ آگہی
2 سمجھتے ہیں سرچشمۂ زندگی
1 وہ اپنے عقائد بدلتے نہیں
نہیں ہوتے اوروں کے طاعت گزیں

محبّت مری اور رحمت مری
مری جستجو اور عبادت مری
مجھے پوجتے وہ بھی ہیں متصل
کہ ہے جن کے پہلو میں بیدار دل
ریاضت کی ان کی عجب شان ہے
کہ مجھ پر ہر اک سانس قربان ہے
مرے فیض سے ان کو القا ہوا
مجھے سمجھے عالم پہ چھایا ہوا
وہی ایک طاقت مگر مختلف
عمل مختلف اور اثر مختلف

دعا بھی ہوں قربانیاں بھی ہوں میں
جو پتروں کو دیں، روٹیاں بھی ہوں میں
میں ہی دوبا، گھی اور شعلہ بھی ہوں
میں ہی منتر اور جلنے والا بھی ہوں
میں ہی عالم بے کران و عظیم
میں ہی پُرکھا، ماں، باپ، منتر اور ندیم
محافظ بھی میں اور مخالف بھی میں
یہاں سے وہاں تک فقط میں ہی میں

میں ہی ”جل پوتر“ اور میں ہی اوم بھی
کبھی یہ ہوں میں اور وہ ہوں کبھی
میں ہی سام، رگ اور یجر وید ہوں
مرے سامنے ہے جہاں سرنگوں
میں ہی رب، میں ہی راہ اور راہبر
میں ہی دادخواہ اور میں ہی دادگر
شہادت بھی دوں فیصلہ بھی کروں
مقید کروں اور رہا بھی کروں
میں ہی مسکن و دشت و جائے پناہ
مرے ہاتھ میں ہے سپید و سیاہ
میں ہی ندی نالا ہوں چشمہ بھی ہوں
سمندر ہوں، ڈل اور دریا بھی ہوں
مجھی سے ابلتا ہے طوفانِ زیست
مجھی سے ہے یہ جوش و طغیانِ زیست
مجھی میں یہ سب جذب ہوتا بھی ہے
مجھی میں چھپا اس کا سوتا بھی ہے
میں ہی لعل و گوہر خزانہ بھی میں
میں ہی بیج اور بونے والا بھی میں

مجھی سے ہیں فصلیں یہ سب انگنت
مجھی سے دروان کا اور بند و بست
مجھی سے ہے سورج میں ایسی اگن
مجھی سے لگی مینھ کی بھی ہے لگن
ہوائیں مری اور گھٹائیں مری
سمندر مرے اور فضائیں مری
میں ہی موت ہوں اور حیات دوام[1]
میں ہی ست[2] است بہر خاص و عام
جو ہے چشمدیدہ وہ ہستی بھی میں!
جو ہے ناشنیدہ وہ ہستی بھی میں!
جنہیں ویدوں کی تہری تعلیم ہے
کہ حکمت پہ مبنی یہ تقسیم ہے
مدھر "سوم[3]" کی ہیں چڑھائے ہوئے
گناہوں سے دھوئے دھلائے ہوئے
جو قربانیاں پیش کرتے رہے
اور اس طرح بنتے سنورتے رہے
درِ جنت اُن پر کشادہ ہوا
کرم اُن پہ حد سے زیادہ ہوا

[1] دائم رہنے والا۔ [2] فانی۔ [3] ایک قسم کی شراب جس کے پینے سے تسکین قلب حاصل ہو۔

غذا وہ ملی جو ہے دیوتاؤں کی
جہاں رہتے ہیں اندر[1] کے ہے، ملی
مگر عیش ہوتا ہے اک دن تمام
ہوا ختم جنت کا سب اہتمام
نکوکاریوں کی جزا مل چکی
ہوئی دہر کی سمت پھر واپسی
تغیر سے اور موت سے پھر دوچار
وہی انبساط اور وہی انتشار
وہ جس کے تھے درخور، صلہ مل گیا
جو منشا تھا ویدوں کے احکام کا
تہ دل سے جب ان کی تعمیل کی
ملی وہ خوشی آنی جانی جو تھی
مبارک مگر وہ پرستار ہیں
جو میری محبت میں سرشار ہیں
نظر جانبِ غیر کرتے نہیں
کسی اور کا دم وہ بھرتے نہیں
میں ضامن ہوں وہ پائیں گے شانتی
یہاں رہ کے اور بعد مرنے کے بھی

[1] سورگ کا دیوتا۔

بظاہر جو اوروں کو ہیں پوجتے؟
پجاری ہیں دراصل وہ بھی مرے
دعا مانگتے ہیں جو اُن کی طرف
پلٹ کر وہ آتی ہے میری طرف
یہ مانا چلے راہ وہ پھیر کی
پرستش ہے پھر بھی، کسی کی سہی
بھٹکتے پھریں، دل تو آمادہ ہے
عقیدہ ہے مضبوط گو سادہ ہے
صلہ کام کا دینے والا ہوں میں
کہ قربانیاں لینے والا ہوں میں
سمجھتے نہیں لوگ فطرت میری
اسی کا نتیجہ ہے نامحرمی
پجاری بنے جس کے اس سے ملے
کوئی پتری سے اور کوئی بھوت سے
جسے میری الفت تھی مجھ سے ملا
نہیں اس میں تخصیص شاہ و گدا
عقیدت سے جو چیز بھی بھینٹ کی
کوئی پھول، پھل، میوہ، پانی سہی

ہوئی نذر فی الفور ایسی قبول
وفا و صفا کا تھا جس میں شمول
پس ارجن یہ لازم ہے تو جو کرے
پیئے، کھائے، یا کوئی قربانی دے
دعا ہو برت ہو کہ تحفہ کوئی
تو نیت یہی ہو تری اُس گھڑی
نہ اس کے لئے ہے نہ اُس کے لئے
ہر اک کام تیرا ہے میرے لئے
کرم بندھ سے یوں ہی چھوٹے گا تو
مزے اپنی نیکی کے لُوٹے گا تو
کسی دن پہنچ جائے گا میرے پاس
اگر ہے عقیدے کی محکم اساس
علاوہ بریں ترک بھی شیوہ ہو
نہ تجھ پر ترے نفس کا غلبہ ہو
نہ اس سے بھلا اور نہ اُس سے بُرا
یہاں میں ہوں سب کے لئے ایک سا
کہ جو کچھ یہاں ہے وہ میرا ہی ہے
کسی سے نہ لینا نہ دینا ہی ہے

محبت سے لیکن جو پوجے مجھے
محبت سراپا وہ پائے مجھے
وہ مجھ میں رہے اور میں اُس میں رہوں
کہ بیتاب دل اُس کا پائے سکوں
یہیں تک نہیں! کوئی بدکار اگر
خیالات میں اپنے دے مجھکو گھر
شمار اس کا نیکوں ہی میں چاہیئے
رہ راست پر آگیا جانیئے
کہ جس نے بھی ڈھونڈا سہارا مرا
وہ بربادیوں سے اماں پاگیا
حقیر اور کم حیثیت کیوں نہ ہو
وہ زائیدہ معصیت کیوں نہ ہو
لگی لَو جہاں مجھ سے پائی نجات
فسانہ ہوئی شرم و عصیاں کی بات
تو پھر برہمن اور شاہی رشی
جنہیں مل چکی برتری، سروری
پرستش یہاں میری کرتے رہیں
خیالات فاسد سے بچتے رہیں

نہ کیوں اور افزوں ہو ان کا وقار
مرے سیوکوں میں بھی جب ہو شمار
جسے ایسی دُنیا میں آنا پڑا
جو ہے آنی جانی نہیں دیر پا
خوشی سے کوئی رابطہ ہی نہیں
ابھی تھا ابھی سابقہ ہی نہیں
اُسے چاہئے میری پوجا کرے
مجھی میں رہے اور مرا دم بھرے
تُو ارجن فقط دھیان مجھ سے لگا
برت مجھ سے رسم وفا و صفا
نہ مرعوب ہونا کسی اور سے
مرے سامنے ہی ترا سر جُھکے
ریاضت جو اس طرح جاری رہے
شرن لحظہ لحظہ مرا ہی رہے
تجھے ہو گی حاصل حضوری مری
نہ پھر دل دُکھائے گی دُوری مری

دسواں ادھیائے

وبھوتی یوگ

اب اسرار ایسے بتاتا ہوں مَیں
تری آگہی کو سُناتا ہوں مَیں
نہیں جس کی روحانیوں کو خبر
بھلا کیا رسا ہو گی فکرِ بشر
یہ دیوتاؤں کی ہے جو فوجِ کثیر
مہارشیوں کا بھی یہ جمِ غفیر
مری ذاتِ عالی سے واقف نہیں
کہ سب میری مخلوق ہیں بالیقیں
یہاں جان سکتا ہے مجھکو وہی
جسے ہے عقیدت کی دولت ملی
وہ دانا ہے اور لوثِ عصیاں سے پاک
نہیں چھانتا غیر کے در کی خاک

نہ پیدا ہوا ہیں نہ مرنا مجھے
نہیں ربط آغاز و انجام سے
کئے میں نے ایجاد عالم ہزار
مجھی سے ہے ان کو ثبات و قرار
میں ہی خالق طینت آدمی
تنوع میں یکسانیت باہمی
ذہانت، فطانت مساوات بھی
تحمل بھی اور تاب برداشت بھی
مدارا و خود داری و راستی
بلندی و پستی و ہموارگی
نشاط و الم، موت اور زندگی
دلیری، حیا، ڈر ہراسیمگی
(اہنسا کہ ہے امن) عزت کی شان
مصیبت میں بھی شرم و غیرت کی شان
کبھی جوش گریہ، کبھی نوشخند
کبھی یہ پسند اور کبھی وہ پسند
خدا ترس بھی، مردم آزار بھی
فراموش کار اور غمخوار بھی

غریبوں کی سیوا بھی امداد بھی
یہ سب چیزیں ہیں میری بخشی ہوئی
وہ "چاروں بزرگ" اور "ساتوں ولی"
شمار ان میں کر لے منو سے بلی
کیا کام میں اپنے شامل انہیں
کہ دنیاؤں پر حکمرانی کریں
مگر ہیں یہ سب میرے پرداختہ
رشی اور منی بھی مرے ساختہ
کرشمہ خیال اپنا دکھلا گیا
کہ موجد یہاں پتریوں کا ہوا
یہیں سے چلیں نسلیں انسان کی
بنائیں پڑیں علم و ایقان کی
جو سمجھا پڑا اسرار عظمت مری
ہوئی نقش دل پر حکومت مری
عقیدت نے وابستہ مجھ سے کیا
بدی اور زبانی سے پیچھا چھٹا
دل اس کا تھا کاشانہ میرے لئے
ہر اک سانس نذرانہ میرے لئے

نفاست خیالوں میں پیدا ہوئی
پُر امن و سکوں ہو گئی زندگی
تکلم میں رنگینیاں بھر گئیں
تبسّم میں شیرینیاں بھر گئیں
مزاج ایسا قائم ہوا بعد ازاں
رہی فکرِ سود اور نہ خوفِ زیاں
بتدریج میرے قریب آ گیا
جو تھا حاصلِ زندگی پا گیا
محبت تقاضا یہ کرنے لگی
کہ ہوں دُور تاریکیاں جہل کی
جہاں چھائی ہے ہر طرف تیرگی
وہاں شمعِ عرفاں کی ہو روشنی

اثر اس کا ارجن پہ ایسا ہوا
کہ بے ساختہ یوں وہ گویا ہوا
خداوند بالا و برتر ہے تو!
جو ہے روحِ پاکی وہ جوہر ہے تو
تو ہی حی و قائم ہے، دائم بھی تو
تجھی سے بقا ہے بقا میں نمو

یہی نارد اور اسِت سے بھی سُنا
یہی دیول اور ویاس کا قول تھا
وہی سن رہا ہوں زباں سے تری
رلی جا رہی ہے کڑی سے کڑی
یقیں دل سے رکھتا ہوں اے شہریار
کہ تو ہے بلا شُبہ پروردگار
نہ دیوتا نہ دیو اور نہ انسان کی
کسی کی رسائی نہ تجھ تک ہوئی
ترا کھوج کیا کیا لگایا نہیں
کسی نے مگر تجھکو پایا نہیں
نہ سمجھا بہت سعی میں نے بھی کی
نہ پائی مگر بات کی تہ جو تھی
ترے روپ بھگوان ہیں بے شمار
کبھی یہ کبھی وہ کیا اختیار
سُنے جاؤں دِل چاہتا ہے یہی
کہ ہیں گھونٹ امرت کے باتیں تری
خوشی ہے یہی جو کرو کے کمار
کہ اپنی حقیقت کرو دل آشکار

تو کرتا ہوں کچھ ایسے حصے بیاں
جو دیں تجکو عظمت کا میری نشاں
میں ہی روح ہوں پُر صفا و ضیا
دلِ اہلِ عالم میں ہے جس کی جا
میں ہی ابتدا، وسط اور انتہا
خبر بھی میں ہی اور میں ہی مبتدا
مجھی کو ہیں کہتے اُدت کا پسر
بشنؔ[1] نام تھا جس کا اے خوش گہر
اُدت وہ خدا ئے صفا و ضیا
اندھیرے میں جس سے اُجالا ہوا
مُرت کا مریچیؔ[2] بھی مجھکو کہا
جو طوفان اور قحط کا ہے خُدا
میں ہی تابشِ خاورِ نیمروزا
رُخِ ماہ کا غازۂ دلفروز
صحیفوں میں بیدوں کے میں شیام ہوں
میں ہی اندر، جنت کا پیغام ہوں
اِدھر اندریوں[3] میں تو میں من ہوا
اُدھر پرشوں میں عقل روشن ہوا

[1] قوتِ نشوونما۔ [2] خوش گوار، دل و دماغ کو فرحت بخشنے والی ہوا۔ [3] حواسِ خمسہ۔

جو رودروں میں شنکر ہوں مَیں بیش بیش
تو یکش اور راکش میں شکل وِتیش
پہاڑوں کی ہوں چوٹیوں میں مُرو
برھسپت جو تاروں میں ہو جستجو
وسو کا ہوں پاوک، ہے پاکی سرشت
جہاں مَیں ہوں، اک حرف باطل ہے زشت
علمداروں میں ہو جو کرنا شمار
سکند جواں مرد کا کر وچار
مرا نام ساگر ہے دریاؤں میں
بھرگ رشیوں میں "اوم" رچناؤں میں
ہمالہ ہوں کہسار کے جُھنڈ میں مَیں
تو "جپ" ہوں اُدھر یگ کے جھرمٹ میں مَیں
درختوں میں اسوتھ کا بسرام ہے
تو نارد خدا بینوں میں نام ہے
میں ہی چتر رتھ مطرب چرخ بھی
میں ہی سدھوؤں میں کپل سامُنی
میں ہی راہواروں میں اچیسرس
نتھارا ہوا جیسے امرت کا رس

جو میں ہاتھیوں میں ہوں ایراوتا
تو پرشوں میں پہلا ہوں میں بادشا
میں ہتھیاروں میں "بجر" سوزندہ ہوں
تپاں ورواں وخروشندہ ہوں
میں ہی کامدھن گئیوں میں ہوں ادھر
کہ ناگوں کا سردار باسک اُدھر
میں اژدر اننت اور سر ہیں ہزار
مجھی پر جھکا ہے بشن نامدار
ورن ہے جو پانی کی چیزوں میں نام
تو ہے آریم پتریوں میں مقام
جو دیوتاؤں میں یم سا دادار ہوں
تو دیتوں میں پرہلاد خود دار ہوں
میں ہی وقت ، پیمانۂ ماہ و سال
تو چوپاؤں میں ارنا بھینسا بسال
درندوں میں شیر سبک تاز ہوں
گرڑ طائر تیز پرواز ہوں
جو نزہت فزا ہے وہ بادِ سحر
میں ہی رام خوبوں میں بھی خوب تر

مگر مچھلیوں میں ہیں کہتے مجھے
تو رودوں میں گنگا سمجھتے مجھے
میں ہی اول و آخر و وسط ہوں
جو ہے یا بظاہر ہے اُس کا بطوں
میں ہی عاقلوں کی ہوں فرزانگی
کلام اور آنکھوں کی بینائی بھی
الف اور مرکب کی ژولیدگی
نہیں انتہا جس کی وہ زندگی
میں ہی آس لے پاس الفت اتھاہ
میں ہی مرگ کی تلخیٔ بے پناہ
ورُود و ولادت کی فوری خوشی
نیا ایک پیغام صورت کشی
میں ہی وہ جو نادیدہ اوصاف ہیں
ازانجملہ نیکی اور انصاف ہیں
میں ہی جاہ و دولت بھی شہرت بھی میں
میں ہی نغمہ، نغمے کی لذت بھی میں
میں ہی صبر اور یاد کی پختگی!
میں ہی صنعت اور پیشے کی طرفگی

میں ہی ویدوں کے بھجنوں میں متسام؟
میں ہی گیا تری بحروں کا انتظام
اگھن ہے مہینوں میں میرا اپنا!
مہکتا ہوا لہلہاتا ہوا!

جوئے میں دو بار آٹھ کا ہندسہ
علامت یہی جیت کی بن گیا
بڑوں کی بڑائی ہوں اور آن ہوں
ہر اک شان والے کی میں شان ہوں
میں ہی فتح ہوں اور میں ہی جنگ ہوں
میں ہی نیکوں میں نیکی کا ڈھنگ ہوں

ورشن نسل کا باسدیو ہوں مَیں
تو پانڈوں میں ارجن تُو ہی تو ہوں مَیں
تو ہی ہاں تو ہی، کیونکہ میرا ہے تو
مرا ماننے والا اور نیک خو
جو تھا اُشنا میرا ہی اوتار تھا!
جو گویوں میں شہرت کا مختار تھا
میں ہی ویاس ہوں ہیر یزداں صفات
تصرف میں جس کے رہتے شش جہات

میں ہی ملک گیری کی تدبیر بھی
میں ہی بادشاہوں کی توقیر بھی
میں ہی علم سینہ ہوں دودان کا
میں ہی "تخمِ روئیدگی" جہان کا
میں ہی مرگ و ہستی و بود و نبود
سکوں و روانی ، نمو و جمود
جو شے ہے رواں یا کہ ساکن یہاں
مجھی سے ہے ساکن مجھی سے رواں
یہاں جو ہے جو کچھ بھی ہے، وہ ہوں میں
کہاں تک سناتا چلا جاؤں میں
لیے آگہی تشنہ پایا تجھے
بالاجمال کچھ کچھ بتایا تجھے
جہاں بھی ہے جو کام حیرت فزا
کرشمہ ہے میرے ہی جبروت کا
مرے جلووں کی انتہا ہی نہیں
یہ چشمہ کبھی سوکھتا ہی نہیں
زمان و مکاں پر ہوں چھایا ہوا
یہ عالم ہے میرا بنایا ہوا

مرے ایک اشارے میں پیدا ہُوا
پر اُس سے الگ ہوں ہویدا ہُوا

گیارھواں ادھیائے

وشوروپ درشن یوگ

یہ ارجن بصد عجز گویا ہوا
زہے بخت مورد کرم کا ہوا
کیا آپ نے رازِ اعظم بیاں
جو پردے میں ادھیاتم کے تھا نہاں
مری روح کو اس سے راحت ملی
اندھیرا تھا چھپ گیا ہوئی روشنی
کمل نین والے، وہ سب کھل گیا
جو تھا ہستی و مرگ کا ماجرا
وہ ہر شے کہ ہے آنی جانی، تری
ازل تا ابد حکمرانی، تری
مگر کیا کروں پھر بھی ہے آرزو
یہی فکر ہے اور یہی جستجو

کہ ہو پوری قدرت سے تو آشکار
جو ہے شان تیری جو تیرا وقار
کسی طرح ممکن ہو گر دھر اگر
کہ میں دیکھ لوں تجھکو بھر کر نظر
تو مالک دعا کے دعا کر قبول
مکمل ہو دیدار تیرا حصول

یہ حسرت ہے تو دیکھ پرتھی کے لال
مری شان و عظمت، جلال و جمال
وہ ہیں روپ میرے ہزاراں ہزار
جنہیں دیکھنے کو ہے تو بے قرار
یہ ملبوس ہیں سب مری ذات کے
نشانی بدلتے اشارات کے
سب اپنی شبیہیں دکھاؤں تجھے
تجلی سے حیران بناؤں تجھے
ہر اک جلوہ سرشار و رنگیں کمال
ہر اک جلوہ پُر ہیبت و پُر جلال
نئے رنگ، ہیں صورتیں ہیں نئی
نئے ڈھنگ، کیفیتیں ہیں نئی

ادت واسو رودر آسون اور مُرت
مِلے اور جدا، جیسے لے ہو درت
عجائب مناظر ہیں اور بے شمار
کبھی کچھ بہار اور کبھی کچھ بہار
کسی کو نہ اب تک دکھائے گئے
تصوّر میں بھی جو نہ آئے گئے
ابھی ہو گی پیشِ نظر کائنات
بیک وقت یکجا حیات و ممات
ہیں اپنے میں سب کو سمیٹے ہوئے
اسے کھینچے اُس کو لپیٹے ہوئے
مجھے دیکھ، جس کی دعا تھی وہ دیکھ
جو پوشیدہ تھا بر ملا بھی وہ دیکھ

نہیں دیکھ سکتی نگاہِ بشر
تو پھر دیدۂ ظاہری بند کر
تجھے حسِ یزدانی دیتا ہوں میں
تجھے چشمِ عرفانی دیتا ہوں میں
بس اب دیکھ، ہاں دیکھ شانیں مری
کہ تسکین پائے تری تشنگی

تبدیلِ بحر

ارجن یہ پکار اُٹھا کہ کیا دیکھ رہا ہوں
منظرِ عجب اک ہوشربا دیکھ رہا ہوں
حیرت بھی ہے، ہیبت بھی، تجلی بھی مقابل
ہے لرزہ بر اندام قضا دیکھ رہا ہوں
یہ سر کی بزرگی ہے کہ افلاک کی وسعت
معمور اسی سے ہے فضا دیکھ رہا ہوں
آنکھوں کا شمار اور نہ چہروں کی ہے گنتی
اسرار کا گنجینہ کھُلا دیکھ رہا ہوں
جو رنگ فنا تھا وہی اندازِ بقا ہے
آئینے کو آئینہ نما دیکھ رہا ہوں
پرچھائیاں ہر سمت لرزتی ہیں یہ کیسی
اک جسم میں ان سب کو چھپا دیکھ رہا ہوں
آغوشِ تجلی میں ہے رعنا قدِ بالا!
ہر سمت نیا حشر بپا دیکھ رہا ہوں
ہے اسلحہ فردوس سے آراستہ پیکر
اور سر پہ مکٹ تاروں جڑا دیکھ رہا ہوں

ملبوس ضیاؤں کا بنا زیبِ بدن ہے
خورشید کی کرنوں کو گرا دیکھ رہا ہوں

انفاس میں گلہائے بہشتی کا ہے جوہر
نکہت سے ہے بدمست ہوا دیکھ رہا ہوں

آنکھوں میں چکا چوند ہے جس سے وہ چمک ہے
چھائی ہوئی بجلی کی گھٹا دیکھ رہا ہوں!

اس بحرِ تجلی میں ہے انوار کا طوفاں
موجوں کے اُبھرنے کی ادا دیکھ رہا ہوں

خورشید جہانتاب نکل آئیں ہزاروں
تابندگی اس سے بھی سوا دیکھ رہا ہوں

پھر نور کا سیلاب شعاعوں سے رواں ہو
اندازہ ہو اُس کا جو کھڑا دیکھ رہا ہوں

عالم ہے سمایا ہوا اک جسم کے اندر
ہر شے کو جُدا اور ملا دیکھ رہا ہوں

بے نام، لطیف اور برا از سطوت و صولت
آنکھوں سے خداؤں کا خدا دیکھ رہا ہوں

جس کے لئے بیتاب تھیں ترسی ہوئی آنکھیں
نظارہ وہ اے دستِ دُعا دیکھ رہا ہوں

سراسیمہ پھر ایسا ارجن ہوا
نہ کھلتا تھا سوتا ہے یا جاگتا
وہ تیورانے اور تلملانے لگا
بدن یک بیک سنسنانے لگا
دو زانو ہوا گھٹنے توڑے ہوئے
جھکا سجدے میں ہاتھ جوڑے ہوئے
اُسی حال میں پھر یہ کہنے لگا
کہ اے ناتھ ہاں تو نے درشن دیا
ہر اک شئی تجھی میں ہے لپٹی ہوئی
کوئی پھیلی اور کوئی سمٹی ہوئی

دو زانو ہوا گھٹنے توڑے ہوئے

تبدیل بحر

زمانے بھر میں جو مخلوق ہے تجھ میں سمائی ہے!
نرک اور سورگ بھی تیرے اندر ہی ساری خدائی ہے
ترے پُرنور پیکر میں ہے مسکن دیوتاؤں کا
کہیں برہما سے بڑھ کر تیری شان خودنمائی ہے
کنول کے تخت پر خاموش تنہا بیٹھنے والے
وہیں رشیوں نے اور منیوں نے بھی محفل جمائی ہے

وہیں ششش ناگ و باسک دیوتا سانپوں کے حاضر ہیں
نرالی شان ہے تیری عجب قدرت نمائی ہے
ہزاروں تیرے بازو ہیں ہزاروں چہرے اور سینے
ہزاروں سر ہیں اور آنکھیں، تجھے زیبا بڑائی ہے
نہ تیری ابتدا کوئی نہ تیری انتہا کوئی
مقام و وقت و وسعت کی مگر تجھ میں سمائی ہے
تو ہی عالم کا ماوا ہے تو ہی ملجا ہے روحوں کا
جسے چھونے کے سب مشتاق ہیں تو ہی وہ ڈھائی ہے
مکٹ ہے سر پہ تیرے ہاتھ میں ترسول اور مہرہ
سجاوٹ سی سجاوٹ ہے، دہائی ہے دہائی ہے
تجھے بیٹھا ہوا میں دیکھتا ہوں تیز اگنی میں
زمیں سے آسماں تک جس کے شعلوں کی رسائی ہے،
فروزاں، برق افشاں، شعلہ ساماں، خیرہ کن، تاباں
شب تاریک دن ہو جائے طلعت ایسی پائی ہے
تجھے میں پوجتا ہوں جس کا ہمتا ہی نہیں کوئی
زہے قسمت کہ یہ بیدار دولت ہاتھ آئی ہے
پناہ نیکی و نیکاں، حد آخر تصور کی!
وہ چشمہ جس سے ہستی نہر اپنی کاٹ لائی ہے

وہ یکتا جو ہے بالا آفرینش کے تسلسل سے
جو ہے موجود لافانی جو خود اپنی کمائی ہے
وہ یکتا جو ہے بیگانہ تغیر سے تعین سے
جُدا ہے سب سے لیکن پھر بھی سب سے آشنائی ہے
جلیل و قادر مطلق حدود فہم سے بالا
ذکاؤ ذہن سے باہر قیاس و وہم سے بالا
وہ جگمگ تری آنکھوں نے رول دی
کہ قلعی مہ و مہر کی کھول دی
ترے چہرے کی ہے خنک روشنی
سپہر و کواکب میں پھیلی ہوئی
اِسی کی تھی اک لہر ا جو زندگی
زمانے کی رگ رگ میں دوڑا گئی
جہانوں کو حیرت سے چونکا گیا
ہر اک جلوہ تیرے کمالات کا
ستاروں سے بکھری ہوئی یہ فضا
فضا جس سے معمور ہے وہ ہوا
ترے دم قدم سے ہے لہکی ہوئی
تری بوئے خوش سے ہے مہکی ہوئی

تری ذات ہے پاک و حیرت فزا
جہاں تو نہ ہو وہ نہیں کوئی جا
پر اسرار و پر ہیبت و پُر شکوہ
تجھے دیکھ کر کانپ اُٹھتے ہیں کوہ
دل ہر سہ عالم میں ہے تھرتھری
پناہ آکے لیتے ہیں دیوتا تری
ترے سامنے ہاتھ جوڑے ہوئے
وہ گر پڑتے ہیں پاؤں چھونے ترے
ترا نام جپتے ہیں پھر زیر لب
ثنا خواں ترے ہو گئے اک ساتھ سب
رشی اور سادھو کو ہے رٹ لگی!
"مہادیو کی جے، جے مہادیو کی"
مغنّی و عارف کا نغمہ یہ ہے
مدھر بول ہیں میٹھی میٹھی ہے لے
"ہری جے، ہری جے، ہری جے، ہری"
"سزاوار ہر بر تری ہے ہری"
یہی نغمہ چھوٹا ہر اک ساز سے
فضا گونج اٹھی اس آواز سے

یہی گاتے ہیں رودر، طوفاں سوار
اُوت جن کے اجسام ہیں شیشہ دار
وسو اور سادھو بھی بسو اتس بھی!
اشمپا مرت اُن کے سب سنگھٹی
اسیون جو کہلاتے ہیں جوڑواں
حسیں پاک طینت بہشتی جواں
اسور اور سدھ را کشش گندھرب
ثنا کرتے رہتے ہیں سب روز و شب
تری ایسی ہیبت ہے نیز احترام
اچانک تجھے پا کے کرم خرام
پرستش میں تیری جھکاتے ہیں سر
نہیں رہتی سر پیر کی کچھ خبر
جہاں بھی ہیں جو بھی ہیں اہل جہاں
وہ سب دیکھ کر تیرا جسم گراں
یہ نیچے ترے، یہ ترا ڈیل ڈول
سماتی ہے دیکھے جنہیں دل میں ہول
یہ پہلو کہ دمکا رہے ہیں جنہیں
ستارے چمک میں جو سورج نہیں

ترے انگنت پاؤں، پھیلے کہیں
الگ، ایک پر ایک رکھے کہیں
کہیں مسکراہٹ کسی مُنہ میں جھاگ
کہیں قہر کی اور کہیں حب کی لاگ
مری طرح تر لوک بھی دیکھ کر
جھکا دیتا ہے تیرے قدموں میں سر
مری طرح لرزاں و ترساں بھی ہے
پراگندہ خاطر بھی حیراں بھی ہے
تجھے دیکھا آکاش چھوتے ہوئے
دھنش جگ کے سب رنگ اچھوتے ہوئے
ہر اک رنگ میں بجلیاں خل ہوئیں
پلک تو نے جھپکائی، اوجھل ہوئیں
جو اکبار تو نے دہن وا کیا!
کٹورا سی آنکھوں کو پھیلا دیا!
مری روح پر مُردنی چھا گئی
چھوئی موئی کی طرح مُرجھا گئی
نہ بھکتی رہی اور نہ شکتی رہی
لرزتی رہی یا سسکتی رہی

دلِ زار ہے اور حیرانیاں
تمناؤں سے ہیں پشیمانیاں
سماں ہے وہ آنکھوں پہ چھایا ہوا
اور آنکھوں سے دل میں سمایا ہوا
بھووں پر تری جب یہ دھوکا ہوا
کہ شعلوں کا بادل ہے امڈا ہوا
لبوں پر اُدھر ڈیڈہاتی وہ آگ
بھسم کردے کونین کا جو سبھاگ
غضب اُف غضب کیا ہوئے کیا ہوئے
دھواں بن کے ارض و سما اُڑ گئے
یہ نظارۂ جانگزا ختم کر
مری بے بسی پر بس اب رحم کر
کھُلا مُنہ ہے اور دانت نکلے ہوئے
لہو لتھڑے جبڑے ہیں پھیلے ہوئے
پیالے اُدھر قعر میں حلق کے
جو پکڑے گئے تھے وہ جھونکے گئے
وہ جھونکے گئے اور چبائے گئے
چبائے گئے اور کھائے گئے

وہ سب آہ جو نازش قوم تھے
جگر بند بوڑھے دھرتراسٹر کے
درونا کرن بھشم اک ساتھ ہی
یونہیں دوسرے شاہ و سردار بھی
سہارا جو تھے دونوں افواج کے
وہ چیرے وہ پھاڑے وہ نگلے گئے
دبوچے گئے جبڑوں کے درمیاں
وہ ٹوٹیں وہ کر کر ہوئیں ہڈیاں
ہوئے خاک اور ایسے غائب ہوئے
سمندر میں جس طرح دریا گھسے
سنبھلنے کی طاقت نہ تھمنے کا بس
نکل بھاگنے پر نہ کچھ دسترس
دہکتے ہوئے غار میں گر گئے
جری لاکھ تھے پھر بھی مُنہ پھر گئے
برابر ہے قائم یہی سلسلہ
چلا جا رہا ہے کھنچا قافلہ
پتنگے اندھیرے میں جو رات کے
جہاں روشنی دیکھی، گرنے لگے

وہ پرواز ہمنام تھا موت کا
وہی شعلہ ان کی لحد بن گیا
چکا چوند سے ایسا اندھا گیا
سوجھ نہ دیا کچھ نہ اچھا برا
عناں زندگی کی ہے اور دستِ مرگ
بجز کسی کچھ نہیں ساز و برگ
ہجوم بلا، رقص وحشت اثر
کسی کو کسی کی نہیں کچھ خبر
تو ہی نے تو ان سب کو پیدا کیا
تو ہی آپ ان سب کو پھر کھا گیا
نہ تخصیص چھوٹے بڑے کی رہی
دو دستی تری تیغ چلتی رہی
ابھی تھے شکنجے میں جکڑے ہوئے
کہ پچے وہ فولادی جبڑے ہوئے
تری ہیبتوں سے ہے سہما جہاں
نہ محفوظ بوڑھا نہ کوئی جواں
چلیں وہ ترے قہر کی آندھیاں
کہ تھا خاک اک جھونکے میں کل جہاں

بتاؤ شنو اے وشنو اتنا بتا
بھیانک ہے کیوں ایسا چہرا ترا
یہ اسلوب کیا ہے یہ انداز کیا
ترے مرڈے کھانے کا ہے راز کیا
مرے دیوتا، پُرغضب دیوتا!
دیا کر، دیا کر، دیا کر، دیا

تبدیل بحر

اس روپ میں میں "وقت" ہوں میں "وقت کشندہ"
اک شعلۂ جوالہ ہوں، اک برق جہندہ
عالم مری تلوار کے سائے میں پلا ہے
اس آنچ میں سکنے کے لئے خلق ہوا ہے
اک تیرے سوا جان کسی کی نہ بچے گی
جز موت نہ اب کوئی غذا ان کو پچے گی
کر خوف کو دُور اور دلیرانہ کھڑا ہو
کر قتل انہیں جگ میں ترا نام بڑا ہو
لڑ راج کی خاطر کہ نئے سر سے ترا ہو
بد سے ہے بدی خوب کہ نیکوں کا بھلا ہو

تو نے نہیں، وہ مَیں ہوں کہ جس نے انہیں مارا
جو مر چکے مرتے نہیں زنہار دوبارا
تُو صرف وسیلہ ہے سبب موت کا مَیں ہوں
تو شوق سے بھسّم اور درونا کا بہا خوں
دے جام فنا ٹوک کے جیدرتھ و کرن کو
دل میں نہ ذرا دخل دے اندوہ و محن کو
ہے ان کی فنا کا سبب اک میرا اشارہ
مقتول کا بھی قتل نہیں تجھکو گوارا؟

لڑ ان کو بہر حال ہے مرنا، تجھے جینا
ممکن نہیں ٹالے سے ٹلے اس کا قرینا

یہ کیشو کے الفاظ جس دم سنے
تو ارجن لگا خوف سے کانپنے
نفس سرد تھا اور نظر تھی جھکی
بہت ضبط کرنے سے سسکی رُکی
کہا دست بستہ چھما کیجئے
خطا بخش دیجئے، دیا کیجئے
ذرا دل جو اُس کا ٹھکانے ہوا
ادب سے ہوا اِس طرح لب کشا

تُو ہی ہے تُو ہی خالقِ ہر بشر
زمانہ جھکاتا ہے طاعت میں سر
خدائے توانائی و زندگی
تو ہی ہے تو ہی ہے تو ہی ہے تو ہی
ترے خوف سے راکشس خیرہ سر
بھٹکتے پڑے پھرتے ہیں دربدر
ترا نام جپتے ہیں سب سِدھ[1] بہم
سمجھتے ہیں بیگانۂ کیف و کم
برہما سے بالا و برتر ہے تو
کہ خلاقیت سے بھی باہر ہے تو
تو ہی مسکن و مرکزِ زندگی!
تو ہی دیوتاؤں کی پائندگی
ہر اک روح کی روح، کُل جزو کا
تو ہی صانعِ گیتی و ماورا!
تو ہی زندگی کا خزانہ ہوا
رواں تجھ سے یہ کارخانہ ہوا
یہاں مرئی و غیر مرئی جو ہے
کرشمہ ہے تیرا، تجھی سے تو ہے

[1] وہ رشی جن کو جلوۂ حضوری حاصل ہو گیا ہو ۱۲

تو ہی ہے خداوند بالا و پست
تجھی سے ہے ترلوک کا بندوبست
تو ہی علم و معلوم و عالم، علیم
تو ہی ہے مقام اور تو ہی ہے مقیم
تو ہی ہے ہر اک شَی میں دوڑا ہُوا
ہر اک رنگ میں آشکارا ہُوا
تو ہی باؤ، یم، اگنی، وارُن تو ہی
برھما، شنشنک اور پرجا پتی
تری جے، تری جے، بتکرار جے
فقط تو ہی جے کا سزاوار ہے
نہ قدرت کی حد ہے نہ طاقت کی حد
بزرگی کی تیری نہیں کوئی حد
تجھے منتری میں سمجھتا رہا!
تری شان و عظمت سے واقف نہ تھا
تجھے کرشن کہکر پکارا کیا
جو غفلت کہ الفت کا تھا مقتضا
سفر یا حضر ہو، ٹھٹھول اور ہنسی
کوئی قید حفظ مراتب نہ تھی

اکیلے میں، لوگوں کے مجمع میں بھی
ہمیشہ مساوات برتی گئی

ہُوا مجھ سے ہر ہر قدم پر قصور
نہ تھا کچھ تری منزلت کا شعور

عطا پاش ہو اور خطا بخش دے
کہ لاعلمی میں جرم سرزد ہوئے

تجھی سے ہیں خلّاق عالم ہے تو
بلندی و پستی، جمود و نمو

پرستش تری ہے تری بندگی
گرو سارے سنسار کا ہے تو ہی

ترا مثل ہے اور نہ ہمتا کوئی
دلیل اپنی آیا ہے تو آپ ہی

ترے سامنے سر جھکاتا ہوں میں
ترا داس ہوں تیرا بندہ ہوں میں

جو برتاؤ ہے دوست سے دوست کا
کہ معشوق و عاشق کی باہم وفا

پسر پر ہو جس طرح لطفِ پدر
خطاؤں سے میری یونہیں درگزر

وہ دیکھا کسی نے جو دیکھا نہ تھا
خوشی کی نہیں ہے کوئی انتہا
مگر خوف بھی دل میں ہے جا گزیں
مرے ہوش ابتک ٹھکانے نہیں
دوبارہ دکھا دے وہ جلوہ مجھے
کہ جس روپ میں جانتا ہوں تجھے
چکر ہاتھ میں اور مکٹ زیبِ سر
اُدھر گرز فولاد کا دوش پر
فقط چار ہاتھوں پہ کر اکتفا
ہزاروں جو دیکھے ہیں اوساں خطا
اور اُس پر یہ چہرے ترے بے شمار
بھلا ہوش کیونکر رہیں بر قرار
یہ بھگوان نے ہو کے خوش تب کہا
جو پردہ تھا مابین وہ اُٹھ گیا
یہ میری دیا ہے کہ آیا نظر
تجھے اس طرح ارجن خوش سیر
تجلی سے لبریز پیکر مرا
فقط ایک تجھکو دکھایا گیا

نہ کچھ ابتدا ہے نہ کچھ انتہا
مگر ہر خبر کا ہوں مَیں مبتدا
کرشمہ یہ ہے آفاقیت کا مری!
کہ سب کچھ ہوں اور پھر بھی سب سے بری
نہ قربانیوں سے کسی کو مِلا
نہ ویدوں کے رٹنے سے پایا گیا
نہ رسمیں ادا کرنے سے پا سکے
نہ تحفے کبھی مجھکو پھُسلا سکے
تپسیا سے بھی ہاتھ آیا نہیں
بجز تیرے جیسا ہوں دیکھا نہیں
نہ کھا خوف ہرگز، پریشاں نہ ہو
جو دیکھا ڈراونے مرے روپ کو
مسرت کو پھر سے جگہ دل میں دے
مجھے جیسا دیکھا تھا پھر دیکھ لے
یہ کہتے ہی ارجن کے تھے سامنے
کرشن جیسے اُس کے تصوّر میں تھے
وہی پیارا مکھڑا وہی روپ تھا
دمکتا ہوا مسکراتا ہوا

تسلی پھر اک بار ارجن کو دی
جو دہشت تھی چھائی ہوئی مٹ گئی
ہوئے بعد ازاں کرشن یوں ہمکلام
بہت سخت و دشوار ہے وہ مقام
مجھے جیسا تو دیکھتا تھا ابھی
نہ یوں دیوتاؤں نے دیکھا کبھی
بہت اس کی حسرت رہی اور ہے
مگر یہ نہ جانا کہ کیسا طور ہے
کوئی راہ اس کی نکلتی نہیں
ریاضت کی بھی دال گلتی نہیں
یہ نعمت ہے دل کے مکیں کیلئے
یہ دولت ہے الفت گزیں کے لئے
مرے کام میں جی کھپاتا جو ہے
تصوّر میں اپنے بساتا جو ہے
نہ کچھ آرزو ہے نہ کچھ مدعا
مجھے پوجنے ہی میں سب کچھ ملا
کسی اور سے جس کو رغبت نہیں
عداوت کدورت کہ نفرت نہیں

تو ارجن مرے پاس آتا ہے وہ
حقیقت میں جیسا ہوں پاتا ہے وہ

بارھواں ادھیائے

بھگت یوگ

ادب سے یہ ارجن نے پھر عرض کی
یہ ارشاد ہو اب ملے آگہی
پجاری ہیں اول تو وہ ذی شعور
جنہیں اپنے ہی نفس پر ہے عبور
دلِ مطمئن سے بعزم و ثبات
ترا نام جپتے ہیں دن ہو کہ رات
پجاری ہیں ایسے علاوہ بریں
تہ دل سے جن کو ہے اس کا یقیں
کہ جو آشکارا و فانی نہیں
تو ممکن پھر اس کی نشانی نہیں
تجھے کیوں وہ پوجیں کسی رنگ میں
گلِ و خار میں لعل یا سنگ میں

اشارات کے اور نہ آیات کے
پرستار ہیں وہ فقط ذات کے
ہوا کون حق کون ناحق پرست
بلند اِن میں ہے کون اور کون پست
رسا کون ہے، کون ہے نارسا
تعلق جہاں تک کہ ہے یوگ کا
یہ بھگوان نے مسکرا کر کہا
بہت خوب، سُن فرق ان دونوں کا
مری راہ میں ہیں جو ثابت قدم
عبادت مری کرتے ہیں دمبدم
مرا دھیان رکھتے ہیں جو ہر گھڑی
اور اس طرح گویا ہیں آنکھیں لڑی
یقیں کامل اور استوار اعتقاد
کہ چاہیئے یوگ پر اُن کے صاد
مگر جو یہ سمجھے کہ لافانی ہوں
فنا ہے مرے سامنے سرنگوں
امٹ اور موجود ہوں ہر جگہ
میں خود اپنا مشہود ہوں ہر جگہ

قیاسِ بشر سے بھی باہر ہوں مَیں
تغیر تعیّن سے برتر ہوں مَیں
کوئی کیا کرے ترجمانی مری
کہ پیدا نہیں ہے نشانی مری
ہمیشہ سے ہوں جاودانی ہوں مَیں
رہوں گا سدا، غیر فانی ہوں مَیں
حواسوں پر اپنے ہے قابو جنہیں
جو اک حال پر رہیں ہر اک حال میں
جو مخلوق سے کرتے ہَیں نیکیاں
وہ مجھ تک ضرور آتے ہَیں شادماں
کہاں مَیں کہاں وضع صورت گری
کہیں اس سے بالا ہَیں شانیں مری
ڈگر ان کی لیکن کٹھن ہے سوا
یہ باطن کی منزل ہے سب سے جُدا
مگر وقف کرتے ہَیں جو اپنے کام
مرے نام پر لے کے میرا ہی نام
کوئی شَے نہیں رکھتے مجھ سے عزیز
بدی اور نیکی میں بھی ہے تمیز

عبادت میں یکسوئیِ دل بھی ہے
یہ جادہ نہیں بلکہ منزل بھی ہے
انہیں مرگ سے بخشتا ہوں نجات
اور اُس زیست سے جو ہے وجہِ ممات
فقط دھیان مجھ سے تو ارجن لگا
خیال اور جانب نہ بھٹکے ترا
تو پھر مجھ میں ہوگی تری زندگی
نہ کچھ اس میں شک ہے نہ پیچیدگی
اگر تجھ میں اب تک یہ قدرت نہیں
جما ایک نقطے پہ اپنا یقیں!
جو ممکن نہ ہو یہ بھی اے نیک خُو
تو ہو میری سیوا میں مصروف تو
ملا کرتا ہے اس طرح بھی کمال
اور ایسا کہ جس کو نہیں ہے زوال
اگر یہ بھی مشکل ہے تیرے لئے
تو باز آ پھلوں سے ہی اعمال کے
مجھے پوج اور ڈھونڈ میری پناہ
مرے ملنے کی یوں بھی نکلے گی راہ

بس اپنی طبیعت پہ قابو رہے
نہ محکوم اُس کا کبھی تُو رہے
ہے ابھیاس سے علم بہتر کہیں
مگر علم سے دھیان بڑھ کر کہیں
جو ہو پھل سے اعمال کے بے خبر
تو یہ بات ہے دھیان سے خوب تر
اسی ترک سے تجکو مل جائے گی
وہ نعمت جسے کہتے ہیں شانتی
جو نفرت سے خالی ہے اور نیک ہے
کدورت سے خالی ہے اور نیک ہے
پڑی جس کو عادت یہاں رحم کی
طبیعت محبت کی خوگر ہوئی!
جو "میں" اور "میرا" کا بندہ نہیں
خوشی اور غم سے علاقہ نہیں
خطاؤں سے کرتا ہے جو درگزر
وہی گامزن ہے مری راہ پر
بہت مجکو پیارا ہے ایسا جو ہے
بہت منزلیں کر چکا ہے وہ طے!

جو صابر بھی ہے اور قانع بھی ہے
جسے دھیان غفلت سے مانع بھی ہے
جسے نفس پر اپنے قابو بھی ہے
عقیدہ بھی محکم ہے خوش خو بھی ہے
مرے واسطے وقف دل اور دماغ
یہی دُھن کہ مل جائے میرا سراغ
بہت مجھکو پیارا ہے ایسا جو ہے
بہت منزلیں کرچکا ہے وہ طے
جو اہل جہاں کو ستاتا نہیں
یہاں وہ ستایا بھی جاتا نہیں
جو شادی و غم کا نہیں مبتلا
نڈر، خود نگر، باخبر، باوفا
بہت مجھکو پیارا ہے ایسا جو ہے
بہت منزلیں کرچکا ہے وہ طے
ضرورت کا جو شخص بندہ نہیں
جو ہے دل کا صاف اور گندہ نہیں
جو ہے چاق چوبند کاہل نہیں
کسی کی بدی میں جو شامل نہیں

جو بے لاگ کرتا ہے ہر کام کو
نہیں دیکھتا صبح یا شام کو
بہت مجھکو پیارا ہے ایسا جو ہے
بہت منزلیں کر چکا ہے وہ طے
جو ہر شے کی حاجت سے ہے بے نیاز
غم و رنج و راحت سے ہے بے نیاز
بدی اور نیکی کو جو تج چکا!
الگ سب سے اپنا محل سج چکا
بہت مجھکو پیارا ہے ایسا جو ہے
بہت منزلیں کر چکا ہے وہ طے
سب اپنے پرائے نظر میں ہیں ایک
اب اس میں کوئی بد گہر ہو کہ نیک
نہ ذلت نہ بدنامی سے وہ ڈرے
نہ کچھ نیک نامی کی پروا کرے
نہ گرمی نہ سردی سے گھبرائے وہ
نہ کچھ فرق دکھ سکھ ہی میں پائے وہ
علاقہ کسی سے نہ مطلب کوئی
بہکنے کا اُس کے نہیں ڈھب کوئی

بہت مجکو پیارا ہے ایسا جو ہے
بہت منزلیں کر چکا ہے وہ طے

نکو ہش کا خوف اور نہ شہرت کی آس
رضا و خموشی کی دولت ہے پاس
نہ گھر بار کی اُس کو خواہش کوئی
نہ شوق نمود و نمائش کوئی
ارادے ہیں مضبوط اور دل جواں
نہ وہ شادماں ہے نہ وہ سرگراں

بہت مجکو پیارا ہے ایسا جو ہے
بہت منزلیں کر چکا ہے وہ طے

یقیں جن کو حاصل ہے نیکی کے ساتھ
لگی جاوداں زندگی اُن کے ہاتھ
سمجھتے ہیں جو سب سے بالا مجھے
دیا کرتے ہیں جو ہے میرا مجھے
مری راہ میں جو ہیں ثابت قدم
مجھی سے جو رکھتے ہیں چشم کرم

بہت مجکو پیارے ہیں ایسے جو ہیں
نہیں اُن سے کام ایسے ویسے جو ہیں

تیرھواں ادھیائے

چھترگیہ یوگ

دیاونت کیشواب ارشاد ہو
جو ہستی کی دراصل بنیاد ہو
علاوہ بریں یہ بھی ہے انتخاب
وہ ہے روح کیسی جو ہے ماورا
جسے علم کہتے ہیں کیا ہے وہ شے
فقط وہم ہے یا حقیقت بھی ہے
تب اس طرح بھگوان گویا ہوئے
کہ گنجینہائے معانی کھلے
ترا جسم بازی گر روح ہے
وہ میدان جس کو یہ کرتی ہے طے
میں ہی شیترگ ہوں ہر اک شیتر کا
ہوا مقصد علم اسے جاننا

بتاتا ہوں کیا شیتر کا ہے سبھاؤ
بدلتا ہی رہتا ہے کیوں اس کا بھاؤ
کہاں سے ہے کیونکر ہے غائب ہے کیا
ہمیں کس طرح علم اس کا ہوا
عناصر، یہ محسوس کن زندگی
قدامت کے باوصف اک تازگی
دماغ اور نادیدہ جوہر لطیف
نہیں کوئی طاقت کا جس کی حریف
وہ دس اندریاں سب عجب شان کی
وہ من، حیثیت جس کی دربان کی
وہ پانچوں حواس ان کی کل مملکت
بہم اختلاف، اُس پہ یکسانیت
خوشی کرب خواہش پسندیدگی
کراہت قناعت ہوس بیشگی!
خیالات کا ہے الگ تار و پود
کھلا ہے ظلمات بود و نبود
حیات اور اُس کا تسلسل مدام
کبھی کوچ ہے اور کبھی ہے مقام

عمل سب ہیں یہ روح کے جسم پر
اسی کے کرشمے اسی کا اثر

فروتن جو ہے ساتھ ہی راستباز
کرے جو نہ دستِ تمنا دراز

جو ہے نیک بیں امن پرور غیور
بدی سے ہے جسکی طبیعت نفور

جسے ہوشمندوں کا ہے احترام
وفا و صفا و حیا سے ہے کام

جو خوددار ہوتے بھی ہیں خودشکن
جبیں جس کی رہتی نہیں پُرشکن

نہیں خواہشِ نفس کا جو غلام
پچھوری خوشی سے نہیں جس کو کام

لگائی بجھائی برائی نہیں
بھلائی ہے اک حرف خاطر نشیں

گنہ، روگ، مرنا کہ جینا کہ سِن
یہ سب وجہہ آزار اِن سب سے گھِن

الگ سب سے، پابند گھر کا نہیں
کوئی بیوی بچوں کی پروا نہیں

کسی سے یہاں اُس کا ناتا نہیں
کوئی رشتہ ایک آنکھ بھاتا نہیں
مصیبت کہ راحت ہو دل کو سکوں
بلا سے اگر یہ ہے کم وہ فزوں
وہ اس شان سے پُوجتا ہے مجھے
زبانہ ٹلے وہ نہ ہرگز ٹلے
سدا اُس کو تنہائی آئے پسند
کہ صحبت میں ہے احمقوں کی گزند
یہ ہے سعی اُس روح تک ہو رسا
جسے کہتے ہیں "ماوراء الورا"
سمجھ کر حقیقی یہی سود ہے
سوا اس کے جو کچھ ہے نابُود ہے
اسی کو کہا عقل اے نیک نام
جو باقی رہا جہل ہے لا کلام
کروں گا اب اُس علم سے گفتگو
جسے ڈھونڈتے پھرتے ہیں چار سُو
وہ سمت جس سے پینے کو امرت ملے!
وہ سمت جس سے عرفاں کی دولت ملے

وہ ست جو ہے آئینہ دار برہم
برہم سے بھی افضل بلا کیف و کم
جو نا آفریدہ ہے، نا دیدہ ہے
علائق سے دامن بھی برچیدہ ہے
صفات اُس کے باہر ہیں تحریر سے
مبرّا ہے جسم اور تعمیر سے
نہ یہ اور نہ وہ پھر بھی دونوں وہی
بہت کچھ علاوہ بریں اور بھی
وہی ہاتھ ہیں ہر جگہ کامراں
اُسی کے ہیں قدموں کے ہر سو نشاں
نہیں ہے اُن آنکھوں سے کچھ بھی نہاں
سُنا کرتے ہیں کان ہر داستاں
اُنہیں چہروں کی روشنی ہر جگہ
وہی چھائے ہیں چھاؤنی ہر جگہ
حواس اُس نے بخشے کہ ہوں رہنما!
مگر خود حواسوں سے بالا رہا
ہر اک شئی کی اُس سے ہوئی تربیت
نہیں پھر بھی آلودہ یکتائیت

وہی صانع شکل و اطوار ہے!
مگر شکل و اطوار سے عار ہے
ہر اک شئی کے اندر بھی اس کا گزر
ہر اک شئی باہر وہی جلوہ گر
وہ ساکن ہے لیکن ہے پھر بھی رواں
کہیں ہے قیاس اور کہیں ہے گماں
وہ موجود ہے پہ نہ دیکھا گیا
لطافت سے خود اپنا پردا بنا
جماعت سے اور فرد سے ہے قریب
کسی کو نہیں پھر بھی قربت نصیب
نہیں دخل کثرت کو کچھ ذات میں
مگر پھر بھی شامل ہے ہر بات میں
کیا خلعتِ زلیست اُس نے عطا
فنا کا بھی پھر قطع جامہ کیا
وہی مارتا ہے جلاتا بھی ہے
جگاتا بھی ہے اور سُلاتا بھی ہے
اندھیرا جہاں تھا اُجالا کیا
اُجالے کا رتبہ دوبالا کیا

وہی عقل اور شیوا ہے عقل کا
وہی اہلِ بینش کا ہے رہنما
ہوئی ان کے دل میں جب اُس کی جگہ
رہی اُن سے خالی نہ کوئی جگہ
یہی زیست ہے حاصلِ زیست بھی
سمجھتا ہے اس راز کا آگہی
جو یوں جان کر پُوچھتا ہے مجھے
وہی پاتا اور بُوجھتا ہے مجھے

نہیں فطرت اور روح کی ابتدا
نہیں کوئی سررشتہ آغاز کا
صفات و تغیر ہیں فطرت کے فعل
سبب اور نتیجہ طبیعت کے فعل
مگر روح سے جسم میں جان ہے
خوشی اور غم اس کی پہچان ہے
جہاں روح وابستہ تن سے ہوئی
اور آگاہ اس کے چلن سے ہوئی
تو گویا ہوئے مرد و زن ایک جا
تناسل کا اک سلسلہ کھل گیا!

کوئی نیک، بد کوئی اولاد ہے!
یہ دُنیا اسی طرح آباد ہے
مگر رُوح زندانِ خاکی میں بھی
رہی پاک و آزاد از آلودگی
نہیں اس کی طینت میں آوارگی
نہ پسپائی و حزن و درماندگی
نظر تن کے افعال پر ہر گھڑی
حکومت بھی کی اور حفاظت بھی کی
جو کچھ کام تھے تن کے اچھے بُرے
نہ زنہار پنہاں رہے رُوح سے
توانا و دانا ہے ایسا جو ہے
نگہداشت یوں اپنی کرتا جو ہے
خداوند و خاتم ہے وہ لاکلام
مجھی سے بہم اور مجھی میں قیام
جو اس طرح اپنے کو جانا گیا
پُرش[1] رُوح کو بھی وہ مانا گیا
کیا کام فطرت کی تائید سے
نہ غافل رہا اپنی ہی دید سے

[1] لافانی

گ
وہ لبریز نورانیت گو -

وہ لبریز نورانیت ہو گیا
نوا سنج ربانیت ہو گیا
جو تھا جسم کا بوجھ ہلکا کیا 3
پڑا پھر نہ اس سے کبھی سابقہ 1
کسی نے کیا گیان سے تجزیہ 2
کسی کا معاون ہوا فلسفہ 2
اگر ساتھ ہی ساتھ تھا خوش صفات
رہی پاک آلودگی سے حیات 1
کوئی سانکھ سے اور کوئی کام سے 4
ہوا ہمکنار اپنے انجام سے 1
عمل کوئی اس پر ہی کرتا رہا! 2
جو کچھ دوسروں کی زبانی سنا 2
یقیں لایا اور مجھ کو پوجا کیا 2
مجھی سے وہ آس اپنی باندھا کیا! 1
رہا وہ بھی دام اجل سے ہوا
دوبارہ قضا نے نہ اس کو چھوا
جہاں زندگی ہے وہیں روح ہے
وہ ساکن ہو یا چلتی پھرتی ہوئے 122

کوئی تخم ہو یا کوئی نخل ہو
کوئی نقش ہو یا کوئی شکل ہو
مجھی کو سمجھ رہ نوردِ وجود
مجھی سے سمجھ شورشِ ہست و بود
مجھے اُس نے دیکھا، ہوا جب شعور
کہ ہر شے میں ہے صرف میرا ظہور
فنا شے کو ہے آتما کو نہیں
یقیں اس پہ ہو، شرط ہے اے ذہیں
کبھی وہ غلط راہ چلتا نہیں
کسی اور سانچے میں ڈھلتا نہیں
ملے اور ملے منزلِ آخری
کہ ہے روح اُس کی خلل سے بری
جو سمجھا کہ فطرت ہے گرمِ عمل!
وہ خود کیا ہے؟ اُس کے عمل کا محل
اُسی نے حقیقت میں دیکھا مجھے
سمجھنے کا جو حق تھا سمجھا مجھے
کھلا جب کہ یہ مختلف ہستیاں
فقط ذاتِ واحد کی ہیں بستیاں

وہیں سے ہیں پھیلی ہوئی ہر طرف
برہم کا ہو اُس کو حاصل شرف
پناہ اُس نے پائی مری ذات میں
نہ تھا فرق کچھ نفی اثبات میں
اُسے جسم سے گو علاقہ رہا!
مگر کرم اور اُس کے پھلوں سے چھُٹا
نہیں جسم آلودگی کا سبب
جگہ نے کیا گندہ ایتھر کو کب؟
فقط ایک سورج کی ہے روشنی
لیے کل جہاں وجہہ تابندگی
اسی طرح کل شیتر تابندہ ہے
فقط روح گو نور بخشندہ ہے
جو چشم تعقل سے دیکھا کیے
وہ سمجھے عمل روح کا جسم سے
بہم کیوں ہے ان دونوں میں کارزار
تصادم کبھی اور کبھی خلفشار
وہ دانا ہیں اور اپنے دمساز ہیں
معمائے ہستی کے غماز ہیں

اُنہیں پر کھلا رازِ ہستی ہے کیا
بلندی ہے کیا اور پستی ہے کیا

چودھواں ادھیائے

ترگن سبھاگ یوگ

جو اس سے بھی اونچا ہے اب سُن وہ گیان
یہ ہے جوہر علم، عرفاں کی جان
جسے جان کر عارف و اہلِ حال
پہنچتے ہیں تا حدِ اوجِ کمال
جو ایسے حقائق سے واقف ہوئے
کیا اعتماد اور برتتے رہے
جنم کے انہوں نے نہ پھر دُکھ سہے
وہ مجھ سے مشابہ ہوئے اور رہے
نکلتے ہیں وہ کلپ کے پھیر سے
فنا کے بھی چھٹتے ہیں اندھیر سے
رحم ہے یہ سنسار جس میں کہ میں
وہ بوتا ہوں جو تخم ہستی کے ہیں

وہیں سے ملا کرتی ہے زندگی
ابلتی رہا کرتی ہے زندگی
حقیقت ہے عالم کی ماتا کی سی
پتا میں ہوں اور تخم پاشی مری
صفا[1] پروری، جہد[2] اور تیرگی[3]
پیے روح زنجیریں ہیں جسم کی
تغیر سے نا آشنا روح بھی
بدلتے ہوئے جسم میں گھُٹ گئی
صفا پروری میں ضیا باریاں
پھٹکتی نہیں پاس بیماریاں
ہمیشہ رہی روح خواہش سے پاک
بڑھا علم اور آنند سے بھی تپاک
مگر جہد میں پیاس خواہش کی ہے
جبھی کام کی اس کو رغبت بھی ہے
جو ہے تیرگی پھل ہے وہ جہد کا
فسوں روح پر جس کا چلتا رہا!
یہی غفلت اور کاہلی کا سبب
یہی سُستی اور بے کلی کا سبب

[1] ستو ؛ [2] رجس ؛ [3] تمس ؛

خوشی سے صفا کوشی مربوط ہے
بہم رشتہ دونوں کا مضبوط ہے
تعلق ہوا جہد کا کام سے
بڑھی تیرگی، مل گئی شام سے
یہاں تک کہ خود عقل پر چھا گئی
ضلالت کا اک جال پھیلا گئی
صفا جہد و ظلمت پہ غالب ہوئی
ہوئی جہد ختم اور ظلمت مٹی
اگر تیرگی در پڑی جہد پر
صفا پروری کا گلا گھونٹ کر
وہیں روح پر چھائی پژمردگی
خموشی تھی اور ضعف وافسردگی
صفا پر جو قابو چلا جہد کا
ہوا تیرگی میں اندھیرا سوا
اگر زندگی کے ہر اک باب پر
ہوئی علم کی روشنی سر بسر
سمجھ لے صفا پروری بھی بڑھی
منڈھے بیل اپنی مرادوں چڑھی

مگر جہد کی لَے جہاں بڑھ گئی
تو لالچ کی رتی وہیں تیز تھی
ہراول بنی اُس کی "مصروفیت"
لگی مارنے دھاوے، بدلی نیت
جلو میں ہوئیں خواہشیں فوج فوج
تمنائیں بے چینیاں موج موج
ہوئی روح جب تابع تیرگی
تو غفلت تھی، دھوکا دھڑی، بےحسی
صفا پروری نے جمایا جو رنگ
تو چھوٹا وہیں روح کا تن سے سنگ
وہ اس طرح آزاد جدم ہوئی
نکو کاروں کی پاک دنیا میں تھی
اگر جہد کے ہاتھوں چھوٹا دیار
ہوئی خلق اُن میں جو تھے مردکار
اگر تیرگی میں ہؤا افتراق
تو اُن میں گئی عقل تھی جن کی طاق
جو ہے کام اچھا تو ہے پھل بھی پاک
مگر جہد کا ہے ثمر دردناک

جہالت اُدھر تیرگی کا ہے پھل
نہ دل میں امنگیں نہ ذوقِ عمل
صفا پروری کا ہے پروردہ علم
اسی کی نظر کا ہے سرکردہ علم
ہوئی جہد، لالچ کی وجہ نمود
دغا کا ہُوا تیرگی سے وجود
وہی تیرگی ہے وہی جہل ہے
بظاہر الگ اصل میں ایک شے
بلندی کی جانب ہوئے وہ رواں
صفا پروری کے جو تھے ترجماں
رہے بیچ میں وہ جو پُر جہد تھے
مگر تیرہ دل سوئے اسفل گئے
جو دیکھا گیا اور سمجھا گیا
گنوں کا ہے سب کھیل کھیلا ہُوا
مگر ان سے بالا ہے طاقت کوئی
تو حاصل اُسے میری قربت ہوئی
یہ تینوں حدیں جب گھڑی طے ہوئیں
فقط جسم ہی سے جو وابستہ تھیں

ہوئی روح آزاد ہر قید سے
امر ہو گئی ناتے رشتے چھٹے
جنم رہ گیا اور نہ غم رہ گیا
نہ اندیشہ بیش و کم رہ گیا
نہ مرنے کی تکلیف باقی رہی
نہ جینے کی خواہش ستاتی رہی
یہ ارجن نے پوچھا بیاں ہو شہا
کہ ایسے پُرش کی ہے پہچان کیا
وہ طے کرتا ہے یہ حدیں کس طرح
سموتا ہے باہم ضدیں کس طرح
تو اُس سے یہ بھگوان کہنے لگے
یہ کہکر جو کہتا ہوں سُن دھیان سے
جسے روشنی سے کراہت نہ ہو
عمل اور بھلاوے سے نفرت نہ ہو
جب ان میں کوئی بر سر کار ہو
نہ اُس کے لئے وجہہ آزار ہو
معطل ہو جب ان کی آمادگی
طلبگار ان کا نہ ہو اُس گھڑی

جو مائل کبھی اُن کی جانب نہ ہو
نہ دے اہمیت ان کی تحریک کو
یہ کہکر کرشمے ہیں اعراض کے
تماشے نظر سے گزرتے ہوئے
کبھی اپنے مرکز سے جنبش نہ ہو
نہ بھٹکے قدم اور لغزش نہ ہو
وہی ہے جسے مُکتی حاصل ہوئی
گنوں کے لئے سدّ فاصل ہوئی
جسے ننگ و ناموس یکساں ہوئے
جسے دشمن و دوست سب ایک تھے
جو قادر ہے ہر فعل کے ترک پر
نہیں جس پہ کچھ خیر و شر کا اثر
وہ طے کر چکا تینوں اعراض کو
کہے کوئی کچھ اُس کے بھاویں نہ ہو
مری راہ میں جو ہے ثابت قدم
پرستش مری کرتا ہے دم بدم
گنوں کا نہ پھر اُس پہ جادو چلا
نہ پرماتما سے ہُوا پھر جُدا

کہ ہے میری تمثیل پر مامتا
حیاتِ ابد ایک اشارہ مرا
مجھی سے دوام اور بقا کا نشاں
سکونِ مکمل بھی میرا نشاں

پندرھواں ادھیائے

پرشوتم یوگ

جسے لوگ کہتے ہیں اسوتھ یہاں!
وہ پیپل ہی کا پیڑ ہے بے گماں
جڑیں جس کی اوپر ہیں شاخیں نکلے
نہ کیوں ہو پوتر اس طرح جو پلے
ہیں پتیاں نغمہ لرزش میں ہے
کہ "مست" جس کی ہے تال سم اور لَے
جو اسوتھ کو سمجھا وہ سمجھا یہاں
کہ ہیں وید میں کیا مطالب نہاں
سوئے آسماں کچھ ہیں شاخیں رواں
تو کچھ ہیں تہ خاک ریشہ دواں
ہری کو پلوں کو جو منتر کہو
تو پتوں کو چاندی کے پتر کہو

تنے کی وہ سبزی کہ من موہ لے
للک اُٹھے کرنوں کو، لپٹیں گلے
اُدھر شوق میں باؤلی ہے ہوا
کہ مل جائے اک پیار امرت گھُلا
حیاتِ بشر کا یہی نقشہ ہے
حواسوں سے وابستہ ہر رشتہ ہے
کشش رکھتے ہیں اور لبھاتے بھی ہیں
نہادِ بشر میں در آتے بھی ہیں
لپٹ کر نہیں چاہتے چھوڑنا
جو ناتا ہے جوڑا اُسے توڑنا
نہاں ہے جو تمثیل کی تہ میں پند
اُسے سمجھو اور اُس پہ ہو کاربند
یہ اسوتھ کہاں سے ہے یہ شکل کیوں
مآل اس کا کیا ہے یہاں دخل کیوں
کرو تیشۂ ترک فی الفور تیز
اور اُن کی جڑوں سے ہو جاری ستیز
کہ ہیں سانپ کی طرح چمٹی ہوئی
سراپا ہے زنجیر لپٹی ہوئی

یہ اسوتھ حواسوں کی یہ زندگی
کہ ہے پست اور وجہِ آشفتگی
اِسے جڑ سے تم کاٹ کر پھینک دو
نہ بھولے سے اس کی طرف رُخ کرو
کہ پھوٹیں نئی شاخیں اور کونپلیں
بلندی جو آکاش کی جا چھوئیں
جہاں ہے فقط دورۂ زندگی
نہ کاہیدگی ہے نہ افتادگی
کہ سرچشمۂ اولیں مل گیا
پسِ پردہ پردہ نشیں مل گیا
"قدامت" سے دیتے ہیں جس کا نشاں
وہی صانعِ کُل، وہی پاسباں
جہاں قیدِ تن سے رہائی ہوئی
تو اُس آستاں تک رسائی ہوئی
اگر خواب نوشین خواہش نہیں
جدائی نہیں، آزمائش نہیں
حواسوں کی رسّی کو توڑا جہاں
جو تھا بے نشاں اُس کا پایا نشاں

ضرورت نہیں بہر نشو و نما
حواسوں کو خوشیوں کی پہنچے غذا
کہ ہوتی ہے خواب آور ایسی بہار
تھکاتا ہے جس کو ہوا کا فشار
اُٹھا کرتی ہیں آندھیاں بے لگاں
پھٹا کرتے ہیں ڈالے اور ٹہنیاں
میسّر ہو کیونکہ سکون و قرار
کہ جھونکے ہوا کے ہیں اور جان زار
اسے چھوڑ دو، ہے اور بھی اک جہاں
جہاں لُٹتی رہتی ہیں رنگینیاں
وہاں کا ہے چاند اور سورج بھی اور
وہ عالم ہے اور اس کی سج دھج بھی اور
اندھیرا یہاں ہے اُجالا کبھی
وہاں ہے سدا روشنی ایک سی
وہاں میں ہوں اور وہ ہے میرا مکاں
نہ چھوٹا جسے مل گیا آستاں
نظر آ گئی جس کو یہ روشنی
دو عالم کی دولت اُسے مل گئی!

حواسوں کی دُنیا جو ہے آشکار
اَمرِ روح کا ہے یہ دارالقرار
مری ذات سے روح طالع ہوئی
قویٰ کی اسی سے ہے صورت گری
کھلا اُس کی خاطر خزانہ مرا
یہ دُنیا مری ہے یہ زمانہ مرا
نہیں اس سے آزاد ادراک و ہوش
مجھی سے نمود اور مجھی سے ہے جوش
چلی روح تو اُن کو لے کر چلی
ہوا تھی کہ ہو کر معطّر چلی
اُسی کی حکومت میں ہیں اندریاں
ظہور اُن کے پردے میں میرا یہاں
نہ یہ راز سمجھے فراموش کار
حجابات میں بھی ہوں میں آشکار
مگر چشمِ بینا ملی ہے جنہیں
مری دید ہے لحظہ لحظہ اُنہیں
تنیاگی نے اپنے میں پایا مجھے!
مُرید ہوس نے بھلایا مجھے

مجھی سے مہ و مہر میں بھی ہے نمو
لپٹ آگ میں اور شعلے میں لَو
میں ہی آ کے دھرتی کی شکتی بنا
مجھی سے ہر اک شے نے پائی غذا
میں ہی "سوم[1]" شبنم کا جوہر بھی ہوں
وہ رس جو ہے پودوں کے اندر بھی ہوں
حرارت لیے اہلِ انفاس ہوں
میں ہی کھلتی کلیوں کی بو باس ہوں
یہاں ہوتے ہیں دو طرح کے منش
کوئی پرکرت[2] ہے کوئی ہے پرش[3]
اُسے ہے فنا اور اُسے ہے دوام
کہ محوِ جہاں کا فنا ہے مقام
دوام اُس کا ہے جو ہے سب سے الگ
مہ و سال سے روز و شب سے الگ
بلند اس سے بھی لیکن اک ذات ہے
عجب شان ہے اور ہی بات ہے
وہ تر لوک بھر میں ہے پھیلا ہوا
اور اُس کی لبعتا کا سہارا ہوا

[1] چاند کی طراوت جس سے پودے نشو و نما پاتے ہیں۔ [2] مادی۔ [3] روحانی۔

وجود و عدم[1] سے جو بالا رہا
جو پرشوتم اس طرح مانا گیا
جو سمجھا اور اِس طرح سمجھا مجھے
وہ آگاہ نکلا ہر اک بھید سے
مری سیر دن رات کرتا رہا
مرا دم وہ ہر آن بھرتا رہا
اِدھر دیکھ اے ارجن با صفا
پُر اسرار یہ مسئلہ سُن لیا

جو یوں مجکو سمجھا وہ ہشیار ہے
کیا فرض پورا، خبردار ہے

---

[1] جو مادّہ اور زندگی سے بالاتر ہے۔ خدا۔

سولھواں ادھیائے

دیواسُر سمپت یوگ

بتاتا ہوں انسان کے اب وہ صفات
کہ ملتی ہے جن سے دوامی حیات
نڈر ہیں وفا و صفا و حیا
دل پاک اور مشغلہ علم کا
سخی، لذتِ نفس سے عار بھی
خداترس بھی، راست گفتار بھی
جو ہے منکسر اور نیکو شعار
مگر اُس کے با وصف ہے بردبار
کسی کو جو آزار دیتا نہیں
جو اوروں کا احسان لیتا نہیں
جو مدِ نظر رکھتا ہے اعتدال
غم و غصہ ہو خوشدلی یا ملال

نہیں اُس کو پروا کچھ اُن چیزوں کی
جو اوروں کی ہیں وجہِ آسودگی
غریبوں سے کرتا رہے جو سلوک
سمائے نہ آنکھوں میں شانِ ملوک
نہیں خوردہ گیری کی عادت جسے
مروّت ہے جیسے مودت جسے
مصیبت کے ماروں کا ہمدرد ہے
اور اپنے عزائم میں پامرد ہے
قناعت کی نعمت سے ہے بہرہ ور
حمایت میں حق کی ہے سینہ سپر
جو نیکوں کا ہے وہ طریقہ بھی ہے
خوش اسلوب ہے خوش سلیقہ بھی ہے
کریں خواہشیں مضطرب کیا مجال
خود اُن کو ہو اُس کے عوض انفعال
بلند اُس کی ہمّت ہے فرزانہ ہے
خیالاتِ باطل سے بیگانہ ہے!
عدو سے نہیں خواہشِ انتقام
نہیں خود ستائی پہ مبنی کلام

میسّر ہوں اوصاف بالا اگر
تو زیبا ہے نازاں ہو جتنا بشر
کہ اُس راہ کا جب وہ سالک ہوا
الہٰانہ قدرت کا مالک ہوا
جہاں ہیں رعونت کی بیباکیاں
ستمگاریاں اور سفاکیاں
فریب و دغا مکر ، گفتار بد
غضب ، کینہ ، بغض و حسد ، رد و کد
جہالت جو اس درجہ اندھی ہوئی
کہ حس اندھے پن کی نہ باقی رہی
یہ سب ان کے آثار و اطوار ہیں
اسوروں میں شامل جو بدکار ہیں
جو بدبخت ایسوں میں پیدا ہوا
گرفتار کرموں میں اپنے رہا
بہشتی ولادت ہے وجہہ نجات
عطا کرتی ہے جاودانی حیات
تجھے مژدہ ارجن سُناتا ہوں میں
صفا کوشوں میں تجکو پاتا ہوں میں

سُنے تو نے جو تھے بہشتی کے گن
اسوروں کی اب مجھ سے پہچان سُن
سمجھتے کسی طرح جاہل نہیں
یہاں روحیں کیونکر اتاری گئیں!
جو آئیں تو واپس ہوئیں کس طرح
دوبارہ وہ مجھ سے ملیں کس طرح
نہ ان لوگوں کو وقعت راستی
نہ پابند آئین کی زندگی
صفاکیش یا نیک باطن نہیں
نہ باطل سے نفرت نہ حق کا یقیں
ہمیشہ یہ بیہودہ گفتار ہے
نہ قانون ہے اور نہ دادار ہے
سبب ہے نہ کوئی مسبب یہاں
نہ کچھ آفرینش کا مطلب یہاں
یہ کہکر کہا کرتے ہیں بد لگام
نہ کیوں رکھئے خواہش پرستی سے کام
نہیں عقل و دانش سے بہرہ انہیں
نہ کچھ نیک و بد اپنا سوجھا انہیں

وہ ہیں اور دن رات بدکاریاں
نہیں جانتے کیا ہے سود و زیاں
بجھائے سے پیاس اُنکی بجھتی نہیں
سمجھتے ہیں وہ زہر کو انگبیں
دغا ہے حماقت ہے یا ہے غرور
وہ اندھے ہیں دانائی سے کوسوں دور

یہ گمراہ انساں، ظلوم و جہول
مقرر نہیں کوئی جن کا اصول
کبھی راہ ہموار چلتے نہیں
کبھی ظلمتوں سے نکلتے نہیں
نہ حد خواہشوں کی نہ کچھ انتہا
بجز مرگ کیا خاتمہ ہو بھلا
اُمیدیں ہیں اُن کی ہزاراں ہزار
کھڑی ہیں جو روکے ہوئے رہگزار
گلے میں یہ پھندوں کو ڈالے ہوئے
بغل میں ہیں سانپوں کو پالے ہوئے
اور اس پر یہ حسرت کہ دولت ملے
جو دولت ملے تو فراغت ملے

جو دھن ہاتھ آیا ، توکل کے لئے
جلائے گئے آج ہی سے دیئے
خوشی ہے کہ دشمن چڑھا اُن کی گھات
بجاتے ہیں بغلیں کہ دی اسکو مات
یہ اس فن میں استادِ کامل ہوئے
وہ غارت ہوئے جو مقابل ہوئے
ہوئی جیت ان کی وہ مارے پڑے
رہے کھیت وہ، ان کے جھنڈے گڑے
رہے جس کی خاطر بہت تشنہ لب
نصیب ان کو ہوگا وہ آرام اب
گرہ میں ہے زر، زور بازو میں ہے
نہ تھا جس پہ قابو، وہ قابو میں ہے
کسی کو بڑا ناز ہے نسل پر!
یہاں کون ہے مجھ سا عالی گہر
کروں گا میں اب پیش قربانیاں
بہت کر چکا فتنہ سامانیاں
غریبوں میں بانٹوں گا خیرات اب
اڑاؤں گا گلچھرے دن رات اب

جہالت کے بندے ہیں گمراہ ہیں
سمجھتے نہیں اپنے بدخواہ ہیں
زبوں کار تھے اور غلط کوش تھے
بظاہر تھے ہشیار، بیہوش تھے
نہ دیکھا بچھایا ہے مایا نے جال
نہ سوچے کچھ اپنے گنوں کا مآل
بالآخر نرک میں وہ جھونکے گئے
نہ پائے گئے ایسے کھوئے گئے
نہ ہٹ اُن سے چھوٹی نہ ٹوٹا غرور
ہمیشہ رہے نشۂ زر میں چور
کہاں یہ کہاں پاکدامانیاں
ریاکاریاں تھیں کہ قربانیاں؟
جو ندی چڑھی تھی اُتر تی گئی!
مگر "میں" کی لے اور بڑھتی گئی
وہی ڈینگ تھی اور وہی تھا غرور
وہی غیظ اور خواہشوں کا وفور
محبّت کے بدلے تھے مجھ سے نفور
یہاں تک تو کھو بیٹھے عقل وشعور

یہ بدکار یہ ننگ انسانیت
بنائی گئی اُن کی آخر یہ گت!
کہ چکر میں کلپوں کے ڈالے گئے
گلائے گئے اور ڈھالے گئے
شیاطیں کے رحموں میں جکڑے ہوئے
پڑے ہیں غلاظت میں لتھڑے ہوئے
یونہیں اور گرتے چلے جائیں گے
سب اپنے کئے کی سزا پائیں گے

ہوس خواہش و خشم میں مت الجھو
انہیں تین پھاٹک نرک کے سمجھو
کریں رہزنی جو وہ ثالث ہیں یہ
خودی کی تباہی کا باعث ہیں یہ
بچا ان سے دامن مضر پھر نہیں
اگر چل گیا داؤں ان کا کہیں
جو ان تیرہ راہوں سے بچ کر چلا
بلندی کی جانب برابر چلا
ابھرتا رہا اور پھلتا رہا!
باندازِ خورشید چلتا رہا

مگر شاستر سے جو باغی ہوا
رہے یاد ارجن وہ داغی ہوا
جو مغلوب خواہش سے اپنی ہوا
بھٹکتا پھرا اور مارا پڑا
کمال اُس کو حاصل ہو ممکن نہیں
وہ پاکوں میں شامل ہو ممکن نہیں
خوشی سے سروکار اس کو نہیں
بلندی سے بیوپار اُس کو نہیں
رہے ہادی و رہنما شاستر
از آغاز تا انتہا شاستر
ترازو بد و نیک اعمال کی
کوئی اس سے بڑھ کر نہ ہے اور نہ تھی
جو منشا ہے اُس کا وہی تو کرے
تجاوز نہ ہرگز سرمو کرے

سترھواں ادھیائے

تری وبھاگ یوگ

تمہید از مترجم

ترے گن وہ لڑیاں ہیں اے خوش نظر
کہ جس سے گندھی پرکرت سربسر
یہ لڑیاں ہیں ست اور رجس اور تمس
اب ان کے مطالب پہ ہو دسترس
نشاں ست ہے پاکی کا اور ہے سپید
یہی نیکی و راستی کی نوید
رجس کہتے ہیں جس کو ہے سُرخ رنگ
یہ ہے خواہش اور مستعدی کا ڈھنگ
اسی میں ہے قوت بھی اور اضطراب
بعینہ ہے سیماب کا پیچ و تاب
سیاہ اور بھاری تمس کی لڑی
عوض جوش کے کاہلی ، ہٹ بڑی

نہیں فرق جب تک یہ ہیں ناپدید
مگر ان میں ہیجاں ہو جب شدید
تو اُس وقت ہوتے ہیں یہ رونما
جبھی چاہیئے اُن کو پہچاننا
بُدھی ہے ، اہنکار ہے یا سکوں ا
کسی میں کوئی کم ، کسی میں فزوں
تعلق سے ہوتا ہے ان کے عیاں
جو کردار کا فرق ہے درمیاں
اسی کا نتیجہ ہے پھل مختلف
چلن مختلف اور عمل مختلف
جو عاقل ہیں کرتے ہیں کوشش یہی
کہ حاصل ہو ان تینوں سے مخلصی
انہیں اپنے قابو میں لاتے ہیں وہ
رہائی سلاسل سے پاتے ہیں وہ
گنوں کی جہاں طاقتیں گھٹ گئیں
وہیں روح کی بیڑیاں کٹ گئیں
ہوئی نغمہ سنج اپنے انداز میں
نشیمن ملا ایک پرواز میں

اثر

سترھویں ادھیائے کا آغاز

یہ ارجن نے کی عرض شاہ شہاں
اب اُن لوگوں کا حال کیجئے بیاں
جنہیں شاستر کی نہیں فکر کچھ
نہیں اس کے احکام کا ذکر کچھ
مگر پھر بھی یگ کرتے ہیں خوش یقیں
جُھکی رہتی ہے بہر طاعت جبیں
یہ فرمائیے ہم انہیں کیا کہیں
سمجھ لیں بُرا یا کہ اچھا کہیں
ستوگن ہوئے یا رجوگن ہوئے
نہیں یہ تو پھر کیا تموگن ہوئے؟
کہا تین قسموں کا ہے اعتقاد
سن اور یاد رکھ ارجن خوش نہاد
کوئی ست کے رستے پہ ہے گامزن
کوئی نفس کی لذتوں میں مگن
کوئی محوِ ظلمت یہاں ہو گیا
نہ سمجھا کہ جو سو گیا کھو گیا!

تقاضائے فطرت ہویدا ہوا
جیسے ساز جس سے تھا ویسا ہوا
مجسم ہوا جو تھا جس کا خیال
پجاری کے من کی ہے مندر مثال
ستوگن کو ہے ربط دیوتاؤں سے
دم ان کا بھرے نام اُن کا جپے
رجوگن، سو ہے راکشش کا غلام
کبھی یکش ہوتے ہیں قائم مقام
تموگن، سو بھوتوں پہ مائل ہوا
پریتوں کی قدرت کا قائل ہوا
جو ویدوں سے غفلت برتتے رہے
تپسیا مگر خوب کرتے رہے
ہدایات کیا ہیں خبر ہی نہیں
خبر ہے تو اس کا اثر ہی نہیں
یہ سب لوگ ہیں خود نما خود فریب
فقط اپنے پندار کا ہے نہیب
یہ ہیں نفس سرکش کے مارے ہوئے
نہ سمجھے کدھر سے اشارے ہوئے

مزاج ان کا قابو میں ان کے نہیں
کبھی تو ہیں خائف کبھی خشمگیں
یہ ایذائیں پہنچاتے ہیں جسم کو
کہ بیداد اس کی یونہیں ختم ہو
انہیں عقل سے کوئی بہرہ نہیں
حواسوں پہ طاقت کا پہرہ نہیں
نہیں جانتے ان کے بھیتر بھی ہوں
ٹلے کس طرح ان کے ٹالے فسوں
شیاطین کے یہ پرستار ہیں
اشارے پہ چلنے کو طیار ہیں
سہ گونہ غذا جیسے انسان کی
عبادت بھی ہے تین عنوان کی
غذا جس میں قوت ہے صحت بھی ہے
خوشی بھی ہے آرام وراحت بھی ہے
غذا جو ہے مرغوب اور خوشگوار
ستوگن اسے کرتے ہیں اختیار
غذا دوسری دیتی ہے اضطراب
پئے جسم وجاں باعث التہاب

جو دیتی ہے نا شادی و درد بھی
دم سرد بھی اور رخ زرد بھی
بڑی تلخوش ہے بڑی تیز ہے
بڑی گرم اور فتنہ انگیز ہے
بھڑکتی ہوئی خواہشوں کی غذا
رجوگن اُسی کا رہا مبتلا!
بڑی اُلسی گندی گھنونی غذا
تموگن کو پچتی وہی ہے سدا
اُسی سے ہوئے اُس کے لب آشنا
پسند اُس کو آیا یہی ناشتا
یہی حال قربانیوں کا بھی ہے
بھلی کوئی ہے اور بُری کوئی ہے
صلے کے لئے جو نہ کی جائے گی
جو سپنے سنہری نہ دکھلائے گی
جو احکام ہیں شاستر کے کھُلے
بلا حیل و حجت وہ برتے گئے
تو اندوہ و غم سے رہائی ہوئی
مرے آستاں تک رسائی ہوئی

وفا آشنا ہے جو پرہیزگار
دعا مانگتا ہے یہی بار بار
نہ بہکا کروں اور نہ بھٹکا کروں
جو ہے فرض میرا وہ پورا کروں
ستوگن ہے۔ اور اُس کی قربانیاں؟
خود اپنے توڑے کی نگہبانیاں!
نہ وہ سرگراں ہے نہ وہ بدگماں
عمل اُس کے بے لوث، خاطر نشاں
جو قربانی ہو فائدے کے لئے
کہ نام اُچھلے اور دھاک اُس کی بندھے
رجوگن کا فعل اُس کو بھارت سمجھ
لگاوٹ کو ہے دخل، اکارت سمجھ
وہ قربانی آئیں کے جو ہے خلاف
نہ دل پاک ہے اور نہ نیت ہے صاف
جہاں بھوگ تقسیم ہوتا نہیں
طبیعت اُچاٹ اور دل بے یقیں
جہاں گہما گہمی بھجن کی نہیں
قبول ایسی قربانی ہوتی نہیں

تموگن کے اعمال وافعال ہیں
یہ تاریکیوں کے بُنے جال ہیں
اگر دیوتاؤں کی پوجا رہے
اُدھر برہمچاری سبتیا رہے
گرو اور پُرکھوں کی عزت بھی ہو
دلِ پُر صفا کی حفاظت بھی ہو

باخلاص دیا مردی و احتیاط
ہمیشہ رہے نیکی سے ارتباط
غریب اور بیکس کی سیوا کرے
نہ یہ ہو قہر اُن پہ ٹوٹا کرے
جو ہیں دھارمک اُن کے یہ کام ہیں
یہ سچی محبت کے پیغام ہیں
زباں پر ہمیشہ رہیں میٹھے بول
مدھر ایسے امرت دیا جیسے گھول
حقارت کہ ذلت کا پہلو نہ ہو
وہ لہجہ کہ ویدوں کو دھیرے پڑھو
یہی سچی گفتار کا دھرم ہے
کہ دل موہ لیتی ہے اور نرم ہے

دلِ مطمئن رحم گستر، غنی
خموشی میں خود ضبطی کی چاشنی
یہ آثار ہیں خود نگر روح کے
ہمیشہ جو آگے ہی بڑھتی رہے
جو قابو میں دل ہے تو محکم یقیں
صلے کی تمنا کہ پروا نہیں
جو تہری ریاضت میں مشغول ہیں
ریاضِ صفا کے وہی پھول ہیں
نمائش دھرم کی جو ہونے لگے.
کہ شہرت بھی ہو اور عزت ملے
ریا کاریوں کا ہے جس میں شمول
سمجھ لے نہیں اس کا حاصل حصول
رجوگن کے چیلوں کے کرتوت ہیں
نہ کہیے انہیں آدمی، بھوت ہیں
خفیف اُن کے حرکات وہ خود پسند
نہ اطوار اچھے نہ دل دردمند
دھرم جس کی اندھی بدھی ہے گرد
"خود ایذا رسانی" ہوئی جس کی خو

فقط اس لئے، ہاں فقط اس لئے
کہ جب اس طریقے سے طاقت بڑھے
تو ایذائیں اوروں کو دیتا رہے
مگر پار نا ؤ اپنی کھیتا رہے
تموگن کے ہیں کارنامے تمام
بدی اور بد اندیشیوں کے پیام
جو خیرات اس طرح کی جائے گی
امانت ہے واپس جو دی جائے گی
فریضہ ہے ذمے، ادا کیجئے
اسی میں بھلا ہے، بھلا کیجئے
بلا عذر و حجت، بلا مکر و کید
دیا، دے کے رکھی نہ کوئی اُمید
مگر شرط ہے مستحق کو ملے
وہی پھُول ہے جو چمن میں کھِلے
یہی راستی کیشوں کی خیرات ہے
اگر یوں ہو تقسیم، کیا بات ہے
جو خیرات میں یافت کی آس ہو
یہ ڈھارس رہے اس کا پھل پاس ہو

اگر بعد حجت کے خیرات دی
رجوگن کی اُس کو سمجھ ابلہی
غلط وقت و موقع پہ جو دان دے
سِسک کر کوئی جس طرح جان دے
نہ دینا تھا جس کو، اُسی کو دیا
جو کرنا نہ تھا اد بدا کے کیا
تموگن ہے وہ جس کی یہ چال ہے
یہ ہے دان یا جی کا جنجال ہے

سُن اب ذات مطلق کے ہیں کیا نشاں
یہ ہیں "اوم تت ست"، کے اندر نہاں
اسی کے ذریعے سے قائم ہوئے
سب آئیں برہمن کے اور وید کے
اسی سے پڑی ہے بنا یگ کی بھی
ضروری ہے اس راز سے آگہی
تپیا ہو، یگ ہو کہ دینا ہو بھینٹ
تو برکت کے بدلے سمجھ لے نسیٹ
اگر اوم کہکر نہ کی ابتدا
تو جو ربط پاکی سے تھا اُٹھ گیا

وہ سمجھے جنہیں ویدوں پر ہے عبور
کہ کیوں اوم کہنا ہوا پر ضرور
کہا تت جب اس کا یہ مطلب ہوا
صلے سے نہ کوئی علاقہ رہا
نہ تھا کوئی اس کے سوا مدعا
ملے موکش کا پر سکوں راستہ
حقیقت کو تعبیر ست سے کیا
یہی سوئے نیکی بھی ہے رہنما
اسی کا ہے مفہوم افعال نیک
رہے دھیان ارجن یہ ہے فال نیک
ریاضت کی آمادگی ست سمجھ
ثبات قدم یگ میں بھی ست سمجھ
مگر بے یقیں کے نہ ات گت ہوئے
است ٹھہرے یعنی اکارت ہوئے

اٹھارھواں ادھیائے

موکش سنیاس یوگ

بیاں ہو شہا اب ہے یہ التماس
کہ ہے تیاگ کیا اور کیا سنیاس
گل افشاں ہوا یوں وہ دانائے راز
کہ خود راز تھا محو افشائے راز
تمنا کی جب ترک ہو گفتگو
مٹے مثل حرف غلط آرزو
نہ ہو سعی بھی ایسے افعال کی
طبیعت کو ہے جن سے وابستگی
تو سنیاس یا منزل ترک ہے
جو ہے تیاگ وہ حاصل ترک ہے
جہاں کام بے آرزو کے ہوا
ثمر کی توقع نہ لالچ رہا!

وہ عارف بھی ہیں یہ ہے جن کا گماں
کہ ہر فعل عصیاں سے ہے ہمعناں
لہٰذا نہ کر کوئی بھی اختیار
عمل کے چمن کو سمجھ خار دار
مگر بعض کہتے ہیں ایسا نہیں
کہ ترک اچھے کاموں کا اچھا نہیں
عبادت ریاضت کہ خیرات ہو
نہ ہوں یہ تو دن کی جگہ رات ہو
سُن اے "شیر دل" اب مرا فیصلہ
یہاں تیاگ ہے تین اقسام کا
عمل کا ثمر بھُول جانا ہے ترک
علائق سے دامن بچانا ہے ترک
سوم ترک اس کا کہ "میں نے کیا"
مجھے بھی کسی کام میں دخل تھا
نہ ہو ترک قربانیوں کا کبھی
نہ عادت چھٹے خیر خیرات کی
عبادت بھلی ہے ریاضت بھلی
نہیں ترک ان کا بجز ابلہی

مگر ان میں ہر ایک بے سود ہے
اگر فائدہ کوئی مقصود ہے
طبیعت کو باقی رہا جب لگاؤ
کسی گن کا ہرگز نہیں کچھ سبھاؤ
ادھر فرض کا ترک اچھا نہیں
کہو کچھ، اندھیرا اجالا نہیں
یہ ہے خود فریبی کا چھوڑا ہُوا
دل آویز گمراہ کن چٹکلا!
مشقت کہ تکلیف کے کام کو
کرے ترک اور ڈھونڈے آرام کو
یہ ہے ترکِ جہد اور مذموم ہے
جو انجام اس کا ہے معلوم ہے
رہے فرض کی حیثیت فرض کی
مگر بے تعلق ہو آمادگی
نہ مردود پھر ہے نہ معیوب ہے
ستوگن ہے یہ ترک اور خوب ہے
اِبا نا سزا فعل سے اُٹھ گئی
نہ اچھے گنوں میں رہی دلکشی

ملی منزل ترک اہل صفا
تذبذب کا پردا جو تھا چاک تھا
جہاں قید تن ہے، عمل ناگزیر
تو وہ شکل ہے ترک کی دلپذیر
کہ پھل سے عمل کے ہو بیگانگی
جو منظور تکمیل ہے تیاگ کی
پس مرگ ہیں تین پھل کام کے
(جو تیاگی نہیں ہیں اُنہیں کے لیے)
جو مقصود یا غیر مقصود تھے
وگرنہ تھے مجموعہ ان دونوں کے
مگر اہل ترک ان سے آزاد تھے
کہ بیگانۂ قید اضداد تھے
قوی دست ارجن مری بات سُن
بتاتا ہوں اب سانکھ کے تجکو گن
کوئی کام پورا ہو اس کے لئے
سبب پانچ ہیں جو مہیّا کئے
ذرائع ہوں عامل ہو اور ہو اساس
حواس اور جو ہے حواسوں کے پاس

عناصر کی قوت علاوہ بریں
کہیں مائل اور کار فرما کہیں
یہاں جو بھی کرتا ہے انساں کام
انہیں پانچ میں ہوگا اس کا مقام
ظہور اُس کا ہو جسم یا جان سے
کہ تقریر اور اُس کے امکان سے
کوئی کام اچھا، بُرا ہے کوئی!
کھُلا ہے کوئی اور ڈھکا ہے کوئی
جو سمجھا کہ "کرتا" ہے وہ کام کا
نہیں اُس کو کچھ ہوش انجام کا
اُسے عقل و دانش سے بہرہ نہیں
وہ اندھا ہے ہرچند اندھا نہیں
مگر روح جس کی رہی "میں" سے صاف
زباں اور دل کا مٹا اختلاف
وہ لیتا نہیں جان، اگر لے بھی جان
سزا و جزا سے بری اس کو جان
یہاں علم اور شے کہ جس کا ہے علم
اور ان کے سوا وہ جو رکھتا ہے علم

محرک عمل کے یہی تین ہیں!
انہیں سے معیّن سب آئین ہیں
ذریعہ، عمل اور عامل یہ تین!
بہم جمع ہیں اور شامل یہ تین
عمل علم و عالم کے ہیں باب تین
بٹے کیونکر؟ اس کے ہیں اسباب تین
بیاں اب جو کرتا ہوں سن دھیان سے
کہ پائے گا سب کچھ اسی گیان سے
بدلتی نہیں جو وہ اک زندگی
ہر اک زندگی میں ہے دوڑی ہوئی
اکائی ہے تقسیم ہوتی نہیں!
یہ تقسیم اُن کی ہے، اُس کی نہیں
یقیں جس کو اس بات کا ہو گیا
وہ فرد اپنے اعمال کو دھو گیا
اُسے روح پاکی ملی، پاک ہے
تامل تاسف نہ کچھ باک ہے
مگر جس نے باور کیا زندگی
ہر اک شے میں ہے مختلف قسم کی

تو علم ایسا منسوب ہے جہل سے
جو یوں دیکھتے ہیں نہیں دیکھتے
مگر جز و کو کل جو سمجھا کیا
سبب ڈھونڈنے سے جو عاجز رہا
نہ جانا کہ ہے جو ہر علم کیا
اندھیرے میں گویا وہ ٹاپا کیا
عمل جس میں نفرت عداوت نہ ہو
تعلق نہ ہو یا محبّت نہ ہو
جسے پھل عمل کا نہ درکار ہو
وہ گل کر دکھائے نہ کیوں خار کو
مگر کام جس میں ہوس ہے شریک!
جو "میں" سے کھنچا ہے وہ رس ہے شریک
وہ زائیدۂ جہد اور خام ہے
تھکن، بے حسی اس کا انجام ہے
اگر خود پسندی ہے بنیاد کار
یہ نیت کہ افزوں ہو عز و وقار
فقط اپنے سود و زیاں پر نظر
بلا سے جو پہنچے کسی کو ضرر

تموگن ہے وہ بد عمل بد لگام
سوئے منزل تیرگی تیز گام
کیا جس نے ترک تعلق یہاں
ہوئی "میں" سے بیگانہ اُس کی زباں
وفا پیشہ ہے اور سرگرم کار
قدم استوار اور دل ہوشیار
وہ ناکام ہو یا کہ ہو کامیاب
طبیعت نہیں مائل اضطراب
ستوگن ہے یعنی صفا کیش ہے
نگہداشت خود اپنی درپیش ہے
مگر جو ہے شہ زور و شہوت پرست
نجس لالچی اور لذّت پرست
کسی کو ہو ایذا وہ مسرور ہے
حقیقی خوشی سے بہت دُور ہے
رجوگن کے ہوتے ہیں فعل ایسے ہی
حیات اُس کی اک دورِ آوارگی
وہ "کرتا" کہ خود ضبطی ہے جسکو شاق
تمیز اور تہذیب بالائے طاق

جو ضدی دغاباز بد بیں بھی ہے
جو کاہل ہے مخزوں ہے پر کیں بھی ہے
کسی کام میں دل لگاتا نہیں!
قدم سوئے منزل بڑھاتا نہیں
سمجھ لے تمو گن وہی ہے، وہی
دو چار اُس سے ہر لحظہ ہے تیر گی
سن اب فرق یک رنگی اور عقل کا
"دھننجے" یہی تو ہے منشا ترا؟
سمجھتا ہے جس کی بدھی ہے سپھل
عمل کیا ہے اور کیا ہے ترک عمل
نہ کرنا کہاں اور کرنا کہاں
نہ ڈرنا کہاں اور نہ ڈرنا کہاں
غلامی اور آزادی کا امتیاز
یہ کیوں باعث ننگ وہ وجہہ ناز
ستوگن کی ہے ذہنیت کا عمل
کبھی ذخل باقی نہیں جس میں چھل
اگر عقل چوکی پہ کھنتے ہوئے
کہ اچھے ہیں کیا کام اور کیا برے

کسے ترک کیجئے، کسے اختیار
رجوگن کی پھٹکار ہے آشکار
جہاں عقل تاریکیوں میں گھری
غلط راستوں پر بھٹکتی پھری
جہاں بد ہوا نیک اور نیک بد
تموگن کی ہے ذہنیت کی سند
وہ یکرنگی جس کو تغیر نہیں
جو ہے بزمِ تمکیں کی مسند نشیں
ہمیشہ ہیں کہنے میں اُس کے قوے
یہی حال سرگرمیٔ روح کا
حواس اور دم خم سدھائے ہوئے
بدی کی عمارت کو ڈھائے ہوئے
ستوگن کی یکرنگی کا ہے سماں
کیا ختم جو تھا کٹھن امتحاں
اگر خواہش و حب میں یکرنگی ہو
تمنا اُدھر دھرم کے پھل کی ہو
زر و مال و دولت کی بھی فکر ہو
رجوگن کی یکرنگی اُس کو کہو!

وہ یک رنگی جس سے کہ غافل بشر
کبھی خواب و خور سے نہ پائے مفر
نہ اندوہ و اندیشہ ہو دل سے دور
نہ ہو لذت نفس کا کم سرور
تموگن کی یک رنگی ہے بے گماں
عجب اس کا نقشہ ہے، اچرج سماں
سہ گونہ خوشی کیا ہے اب یہ بھی سُن
کہ رہ جائے باقی نہ جائے سخن!
خوشی منزل عیش کی رہ نورد
طرب خیز انجام، آغاز درد
خوشی ابتدا میں جو ہے زہر سی
تھی امرت طبیعت میں جب رچ گئی
ہُوا جوہر عقل سے رابطہ
ستوگن کو اُس سے رہا واسطہ
خوشی جو حواسوں سے پیدا ہوئی
حواسوں نے دی اور حواسوں نے لی
نظر آیا پہلے تو امرت گھلا!
مگر بعد کو مُنہ کسیلا ہوا!

رجوگن کی اُس کو خوشی جانیے
غلط ہے جو اُس کے سوا مانیے
خوشی جو ہے دھوکا خودی کے لئے
کبھی اس سرے اور کبھی اس سرے
بنا اُس کی ہے نیند اور کاہلی
اضافے کو غفلت بھی شامل ہوئی
تموگن کی اس کو سمجھئے خوشی!
مگن اس میں رہتے ہیں بس ایسے ہی
نہ انساں نہ دیوتاؤں میں ہے کوئی
پسند اک نہ اک ہو نہ جن کو خوشی
برہمن ہوں یا چھتری ہوں کہ ویش
پرنتپ سنا؟ یا ہو شُدروں کے جیش
فرائض جو اُن کے ہیں تقسیم ہیں
یہ ناقابل نسخ و ترمیم ہیں!
ریاضت سکوں اور ضبط خودی
تحمل، یقیں، تجربہ، راستی
صفاکیش اور علم کی تشنگی!
ازل سے برہمن کو سونپی گئی!

جلالت علو و ہنر پروری
تجمل، سخا، معدلت گستری
جو ہے چھتری اُس کی فطرت یہ ہے
لڑے ہو کے سنمکھ ہدایت یہ ہے
زراعت کرے اور مویشی بڑھائے
تجارت میں بھی ولیش پیسہ لگائے
جو ہے سودر سیوا وہ کرتا رہے
یہ ہے دھرم اُس کا نہ اس سے پھرے
ادا فرض خوبی سے جس نے کیا
لقب مرد کامل کا اس کو ملا!

بتاتا ہوں اُس کا طریقہ ہے کیا
ترا سوے منزل جو ہو رہنما
وہ اک ذات سرچشمۂ زندگی
یہاں ہے جو ہر شی پہ چھائی ہوئی
پرستش کو اُس کی جو سمجھا ہے فرض
دل و جان سے پورا جو کرتا ہے فرض
پہنچتا ہے وہ تا بحد کمال
ریاضت کا اس کی یہی ہے مآل

کہیں اس سے بہتر ہے ناقص رہا
کہ غیر دل کا بار اپنے ذمے لیا
تقاضائے فطرت جو ہے کر چلے
کبھی اس سے انساں نہ باہر چلے
نہ آئے گا ہستی پہ زنہار داغ
دو عالم کے غم سے رہے گا فراغ
یہ مانا کہ ہے زہر سے تلخ تر
نہ آمادہ ہو فرض کے ترک پر
نہ ہو دل شکستہ جو گیتی کے لال
گزرتا رہ نقص سے ہے کمال
دھوئیں میں چھپی جس طرح آگ ہے
یونہیں نقص و تکمیل میں لاگ ہے
تعلق کو سمجھا جو وجہ گزند
وہ اپنی خودی پر ہوا فتحمند
تمنائیں جس دم ہوا ہو گئیں!
لیے ترک بانگ درا ہو گئیں
تو اس وقت حاصل ہوا وہ کمال
جہاں خواب ہے ہر عمل کا خیال

سُن اب مجھ سے کنتی کے نورِ نظر
نہیں طول مدنظر ، مختصر
کہ انساں کو حاصل ہُوا جب کمال
تو ہوتا برھم سے ہے کیونکر وصال
یہ ہَیں انتہائی حدیں علم کی
عوض خیرگی کے ہَے تابندگی
ہوئی جس کو اچھے بُرے کی تمیز
عمل کی بھی یکرنگی ٹھہری عزیز
کیا جس نے خود ضبطی اپنا شعار
تمناؤں کا اٹھ گیا اعتبار
کوئی نغمہ دل کو لبھاتا نہیں
حواسوں کے چکر میں آتا نہیں
نہ رغبت رہی اور نہ نفرت رہی
جہاں پہ تھی قائم طبیعت، رہی
غذا ہے قلیل اور خلوت پسند
دلیلیں پسند اور نہ حجت پسند
تن اور من پہ قابو، زباں ہَے خموش
ادھر عقل یکسو ، اُدھر جمع ہوش

تمنا سے خالی دل پر گداز
ہر اک سانس میں تازہ راز و نیاز
جو "میں" کی تھی لے وہ بھی دھیمی پڑی
غرور اور طاقت کی نازش گئی
نہ دولت نہ ثروت کا نشہ رہا!
نہ وہ طنطنہ اور غمزہ رہا!
دلِ گرم اور شانتی رہ گئی
جو رہنے کی شے تھی وہی رہ گئی
سمجھ لے برہم سے وہ واصل ہُوا
ملا اصل سے اپنی، کامل ہُوا
بنا خود برہم وہ متین و جمیل
مسافر بھی، منزل بھی، خود ہی دلیل
نظر میں ہوئی ایک مخلوق سب
پرستش مری شغل تھا روز و شب
ہُوا اُس پہ آئینہ آخر یہ راز
کہ بھگتی کا بھی ہے مجھی سے طراز
مجھے اُس نے پہچانا جیسا ہوں میں
کھلا اُس پہ میں کون ہوں کیا ہوں میں

صداقت میں جب اس طرح پا گیا
تو لے دغدغہ مجھ میں داخل ہُوا
قدم پھر وہ جس راہ میں بھی دھرے
بھروسا جو مجھ پہ ہو سُکھ ہی بھرے
بقا سے رہے گا سدا ہمکنار
تغیر سے ہرگز نہ ہوگا دوچار
ہر اک کام کو مجھ سے منسوب کر
تصوّر میں تو مجھکو محبوب کر
مجھی کو سمجھ منزل آخری
میسّر رہے غیب میں حاضری
مجھی پر خیالوں کو اپنے جما
یہاں تک کہ آ اور مجھ میں سما
لگی لو جہاں مجھ سے ہیبت اٹھی
کڑی دھوپ اس دوپہر کی ڈھلی
مگر "میں" کی رفتار اگر تیز ہے
تباہی سے بیکار پرہیز ہے
اگر تجکو "میں" نے یہ سکھلا دیا
کہ جو کچھ ہو میں تو نہیں لڑنے کا

رہے یاد تجھکو یہ کنتی کے لال
خوشی ناخوشی کا نہیں ہے سوال
تو لڑ لے پر آمادہ ہو یا نہ ہو
اٹل ہے کہ صورت یہ پیدا نہ ہو
کہ فطرت میں تیری ہے داخل یہ فرض
ادا ہو کے آخر رہے گا یہ قرض
تجھے لاکھ روکے یہ مایا کا جال
مگر تو رہے باز یہ ہے محال
اگر اس گھڑی جنگ سے ننگ ہے
تو در پیش فطرت سے پھر جنگ ہے
محل دل کا، ایشور جہاں ہے مکیں
کھلونے بناتی ہے مایا وہیں
کھلے کارخانے ہیں ہر قسم کے
بُنے جاتے ہیں جال چھوٹے بڑے
مدد کا ہوا ایشور سے تو خواستگار
اسی کے کرم کا ہو اُمیدوار
ملے، ختم اگر ہو ہر اک جد و کد
سکون دوام و قرار ابد

سکھایا تجھے میں نے رازوں کا راز
حقیقت فروز و بصیرت نواز
سمجھ، پھر سمجھ، غور کر، غور کر
وہی راہ پھر چل، دل اٹھے جدھر
کہا اس لئے مجھکو پیارا ہے تو
مرا ہی، بنایا سنوارا ہے تو
تری یاد ہو وقف میرے لئے
سوا میرے قربانیاں دے نہ لے
رہے ہر گھڑی بس مرا احترام
مجھی میں ہو کوچ اور مجھی میں مقام
ہر اک فرض ہو ترک، ہر کام ترک
مرے واسطے خواب و آرام ترک
تو ہر پاپ سے دوں گا تجکو نجات
کہ جھکتا ہے مجھ سے سرِ کائنات

سُنا تو نے جو کچھ سُنایا گیا
ہر اک شبہ تیرا مٹایا گیا
دھنجے ہوا دام سے تو رہا!
جو مایا نے رستے میں پھیلایا تھا

یہ بول اُٹھا ارجن کہ سچ ہے شہا
کرم نے ترے مجکو سب کچھ دیا
نہ اب وسوسوں کی ہیں دارائیاں
نہ شبھوں کی بجتی ہیں شہنائیاں
پلٹ آئی جو یاد کھو بیٹھا تھا
ہے اب سے مرا ہاتھ دامن ترا
بہت مطمئن اور خوشنود ہوں
بجا لانے کو حکم موجود ہوں

کہا سنجے نے گفتگو تھی یہی!
جو پارتھ میں اور باسدیو میں ہوئی
وہ پارتھ کہ تھی روح جسکی عظیم
وہ پارتھ جو دیوتاؤں کا تھا ندیم
عجب حیرت انگیز تھی گفتگو
مگر عشرت آمیز تھی گفتگو
رشی ویاس نے مجھ پر احساں کیا
ہنر ایسا بخشا کہ میں سُن سکا
اور اس طرح جیسے مرے روبرو
کشن کر رہے ہیں کھڑے گفتگو

پر اسرار تعلیم، لبریز پند
کہ اپنے پر انسان ہو خود فتحمند
کشن وہ خداوند خود ضبطی کا
مہادیو، دیوتاؤں میں بھی بڑا
شہا یاد کرتا ہوں جب مو بمو
جو ارجن سے کیشو کی تھی گفتگو
جو سندر تھی اچرج رُچی اور انوپ
نظر آتا ہے پھر ہری کا وہ روپ
تعجب میں ہیبت بڑھاتا ہوا
مگر ساتھ ہی وجد لاتا ہوا
تو یہ سوچتا رہتا ہوں اُس گھڑی
اور اس سوچنے میں ہے شوبھا بڑی
جہاں کشن خلاق ہے ضبط کا
وہاں ہونا ارجن کا لازم ہوا
جو ہوں دل و دیدہ کی بیداریاں
کمانداریاں ہیں جہانداریاں
جہاں ہیں یہ دونوں وہاں ہے ضرور
کہ ہو امن و دولت کا ہر سو وفور

تدبّر جہاں ہے وہیں فتح ہے
تدبّر ہے خاتمِ نگیں فتح ہے

تمام شد

؎ ۲۰۴ صفحے منظوم ترجمہ کے ہیں اور ۳۲ صفحے تعارف وغیرہ کے۔
پبلشرز